NOVEMBER 2010
ماہنامہ
کرن
اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب
کرن پکوان
EID
WITH
MUBARAK
ALL OF JOYS
Specially for you

Digest Novels Lovers Group

نایاب جیلانی

مکمل ناول

جوں ہی وہ لوہے کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ ایک بے حد ناگوار بدبو اور سڑاند سی نتھنوں سے آن ٹکرائی۔ مہد کو ایک دم ابکائی آنے لگی تھی۔ گیٹ کے ساتھ رکھے ڈرم میں سے کوڑا ابل ابل کر باہر گر رہا تھا۔ ڈھیروں مکھیاں ارد گرد بھنبھنا رہی تھیں۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ کوڑے والے سے ڈرم ہی اپنی نگرانی میں خالی کروا کر احسان عظیم کر دیتا۔

پورے صحن میں جا بجا درختوں کے پتے اور گلا سڑا پھل شاخوں سے گر گر کر ماربل کے فرش کو داغ دار کر چکا تھا۔ بچوں کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر بیرونی دیوار کے ساتھ لگے تھے۔

"کیا پہلے ایسا گھر تھا یہ۔ صرف چند مہینوں میں ہر شے تلپٹ ہو گئی ہے۔"

وہ تلخی سے سوچنے لگا۔ اس قدر شدید گرمی اور جینک میں چار گھنٹے انتظار کرنے کے بعد اس کے اپنے بھی چار ہی بج چکے تھے۔ ابھی وہ لاؤنج میں داخل ہی ہوا تھا جب قاسم بھاگتا ہوا آگیا۔

"چاچی نے سارے کچن کے برتن توڑ دیے ہیں۔ فہد کو بہت مارا ہے۔ اسی لیے تائی امی اور چاچی کی خوب لڑائی ہوئی ہے۔ چاچی جواب دینے کی بجائے ہنستی رہی تھیں۔ بے چاری پاگل جو ہو گئیں۔" قاسم کا لہجہ تاسف سے بھر گیا۔ مہد کے من میں اذیت کی ایک تیز لہر اترتی چلی گئی۔

"قاسم! ایک گلاس پانی تو لا دو۔"

"میں لا دوں بابا!" شفق نہ جانے کہاں سے برآمد ہوئی تھی۔ الجھے بکھرے بال گندے کپڑے اور ٹوٹی چپل پہنے ہوئے۔ مہد کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

"ملیحہ جب ٹھیک تھی تو ایک دن بھی شفق گندے حلیے میں دکھائی نہیں دیتی تھی اسے شفق کو سجانے سنوارنے کا بہت شوق تھا۔" مہد نے بے حد رنجیدگی سے سوچا۔

"چاچو! پانی۔" قاسم نے بوتل اور گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ٹھنڈا پانی نہیں تھا۔" وہ دو گھونٹ اس گرم سیال کو اندر اتارتے ہوئے بے زاری سے بولا۔

"نہیں، کسی نے فریج میں بوتلیں نہیں رکھیں۔" قاسم جواب دے کر بھاگ گیا تھا۔

"دادو کہاں ہیں۔" اس نے پانی پی کر شفق کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں۔"

"کیوں؟ اس وقت تو تخت پر بیٹھتی ہیں وہ۔" اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے حیرانی سے کہا۔

"ماما کو پھر دورہ پڑا ہے۔ اس لیے غصے کی وجہ سے دادو اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں بابا! پتا ہے بابا! کیا کہہ رہی تھیں دادو۔" شفق اس کے گالوں پر دونوں ہاتھ رکھے معصومیت سے بولی۔

"کیا۔" وہ چونکا۔

"کہہ رہی تھیں۔ تمہارا ابا اسے پاگل خانے

چھوڑ کر آئے گی تب ہی باہر نکلوا سکی۔"

"اماں بھی نا، حد کرتی ہیں۔ بچوں سے ایسی باتیں بھلا کی جاتی ہیں۔" اس نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"بابا آپ ماما کو پاگل خانے چھوڑ آئیں گے۔ پھر میں ماما کہاں سے لوں گی۔" وہ آزردگی سے کہنے لگی۔

"ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ آپ ماما کے لیے دعا کیا کرو۔ اللہ انہیں صحت دے۔" وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا تھا۔ ملیحہ بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں زنجیر تھی۔ مہد کے دل میں اک درد کی تیز لہر اٹھی۔

"میں تو روز ماما کے لیے دعا کرتی ہوں۔" شفق نے اس کی گود سے اتر کر ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"چلو پہلے تمہارا منہ دھلوا لوں۔ پھر کھانا کھلاتا ہوں۔" مہد، شفق کو لے کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا۔ پھر اس نے شفق کے بالوں میں برش کیا۔ کپڑے نکال کر پہنائے اور پھر کھانا لے کر کچن سے واپس آیا تو ملیحہ بیڈ پر پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔ مہد نے شفق کے منہ میں نوالے ڈالتے ہوئے اپنے چہرے پر کچھ تپش سی محسوس کی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ ملیحہ اس کے قریب آ کر کارپٹ پر بیٹھ رہی تھی پھر اس نے مہد کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"مہد! آئی لو یو۔" وہ ساکت سا حیران پریشان ملیحہ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر یکا یک خوشی، تعجب اور بے انتہا سرشاری کی کیفیات نمودار ہونے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اماں بی! غصہ مت کرنا۔ ہمیں تو دولہن پسند نہیں آئی۔" چوچک نے حلوے اور نان چنے سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے کہا تھا۔ اماں بی نے پہلے تو گھور کر چوچک کی طرف دیکھا پھر غصے کے اظہار کے طور پر چوچک کے سامنے رکھی ناشتے کی ٹرے کھینچ لی۔

"تین نان، پوری پلیٹ حلوے کی اور سالن کا پیالہ چاٹ کر میری بہو کی شان میں گستاخی کرتی ہے۔ تجھے کس نے اختیار دیا ہے کہ تو دولہن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر۔ اٹھ جا منحوس، میری نظروں کے سامنے سے ورنہ جھانپڑ لگا کر بتیسی باہر نکال دوں گی۔ کمبخت بولتی ہے دولہن پسند نہیں آئی۔"

"سوری اماں بی! میرے پیو کی توبہ، غلطی ہو گئی جی۔" چوچک گھگھیاتے ہوئے اٹھی۔

"چل جا، باورچی خانے میں برتنوں کا ڈھیر لگا ہے۔ پہلے انہیں دھو، پھر مشین لگانا۔" اماں بی تخت سے اٹھ کر چپلیں ڈھونڈتی ناراضی سے بولیں۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں بولا۔ آپ تو خوامخواہ ہی خفا ہو رہی ہیں۔ یہی بات تو پورے گھر میں پچھلے ایک ماہ سے سب کی زبان پر ہے۔ اگر میرے منہ سے کچھ پھسل گیا ہے تو آپ آگ بگولا ہو گئیں۔ بہوؤں، بیٹیوں کو نہ روکا نہ ٹوکا اور مجھ بے چاری کے اوپر سارا نزلہ گرا دیا ہے۔ سچ ہے جی، غریب کی بھلا کیا عجت (عزت) ہر طرف سے پھٹکار ہمارے حصے میں بھائی دوڑی چلی آئی ہے۔" چوچک منہ ہی منہ میں بڑبڑ کرتی جوں ہی باورچی خانے میں داخل ہوئی سامنے موجود نئی دولہن کو دیکھ کر گویا اسے دانتوں پسینہ آ گیا۔

"سلام بی بی!" کچھ نہ سوجھا تو شرمندگی کی ماری چوچک نے فوراً "سلام" جھاڑ دیا۔ ملیحہ نے مڑ کر دیکھا اور پھر سر ہلا کر چوچک کے شرمندگی میں ڈوبے سلام کو قبول کر لیا۔

"بھائی صاحب لوگ دفتروں اور کالجوں میں نکل گئے۔" وہ خجالت مٹانے کی غرض سے اپنی بھدی آواز میں پوچھنے لگی۔ ملیحہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی سماعتوں میں ابھی تک کچھ دیر پہلے اس منہ چڑھی ملازمہ کے الفاظ ——— تھے۔ چوچک جیسی مطلبی، خوشامدی سی ملازمہ کو جلد اپنی غلطی کا ادراک ہو گیا تھا۔ جبھی تو وہ تیز گام کی طرح تیز تیز بول رہی تھی۔ گویا کچھ دیر پہلے اپنے منہ سے نکلنے والے الفاظ کے

اڑ کو زائل کرنا چاہتی تھی۔

"مسکان بی بی بھی کلینک چلی گئی؟ انہوں نے دوائیوں کا نسخہ نہ جانے لکھا بھی ہے کہ نہیں خیر دو بجے تک تو آجائیں گی۔ اور بڑی بھابھی بھی آج جلدی دفتر چلی گئی ہیں؟ ان کے بچوں کے یونیفارم دھونے تھے میں نے بسمہ بھابھی۔"

"مسکان روزانہ نو بجے کلینک چلی جاتی ہے۔ نائلہ بھابھی کا دفتر ٹائم آٹھ بجے سے چار بجے تک ہے۔ بسمہ بھابھی کا کالج ٹائم بھی یہی ہے۔ جبکہ نادیہ بھابھی اور معراج بھائی ساڑھے دس بجے تک نکلتے ہیں۔ معراج بھائی کو ٹریول ایجنسی اور نادیہ بھابھی کو اپنے دفتر میں اتنے سویرے جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان سب کے تینوں بچے بھی اس وقت اپنی اپنی درس گاہوں میں جا چکے ہیں۔ منہب، ثملت، مانیہ، بلیم بھی اسکول اور کالج میں اپنے چاچو جان کے ہمراہ چلے گئے ہیں۔ باقی میں اور اماں بچے ہیں۔ تو ہم دونوں ہستیاں آپ کے سامنے موجود ہیں۔ کچھ اور پوچھنا ہے تو پوچھ لو۔ اس کے بعد کسی سوال کا جواب نہیں ملے گا۔ روزانہ باتیں مٹھار کر جھاڑو لگایا لیک جھپک پونچھا لگایا اور کچرا کونوں کھدروں میں سے نکالنے کی زحمت کیے بغیر ہاتھ جھاڑتی نظر بچائے بھاگ جاتی ہو۔ نائلہ بھابھی کے بچوں کے یونیفارم پہلے دھو کر آؤ۔ آج ان کی کام والی چھٹی پر ہے پھر آکر صفائی وغیرہ کرنا۔"

ملشہ نے کیبنٹ اچھی طرح صاف کر کے اچار' دالیں' چاول' سونف اور اجوائن کے بڑے بڑے جار ترتیب سے رکھنے کے بعد کیبنٹ کو تالا لگایا اور دوسری الماری کی طرف بڑھ گئی۔ یہ الماری کچن کے دائیں جانب دیوار میں نصب تھی۔ اس میں سرف' صابن' نیل' ٹوتھ پیسٹ اور شیمپو وغیرہ کی بوتلیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ مہینہ بھر کا تمام سودا اماں یکم تاریخ کو منگوا لیتی تھیں۔ مگر نہ جانے کیسی بے برکتی تھی کہ ابھی پندرہ دن گزرتے تھے کہ سرف سوڈے کے ڈبے صابن ٹوتھ پیسٹ وغیرہ ایک ایک کر کے غائب ہونے لگتے اور مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی اماں سر پکڑے ہاتھ میں موجود گنے چنے نوٹوں کو یاسیت سے دیکھنے لگتی تھیں۔ جبکہ بچوں کی فیسوں کا پہاڑ ابھی سامنے ہی موجود ہوتا تھا۔

ملشہ جلد ہی "کچن چور" کو دریافت کر چکی تھی اور یہ بڑے بڑے لشکارے مارتے تالے بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جبھی تو محترمہ چوچک صاحبہ کو اس گھر کی آخری نمبر والی یہ بہو جو مہینہ بھر پہلے خالصتاً "اماں بی کی پسند سے جلوہ افروز ہوئی تھی اور جسے دیکھتے کے ساتھ ہی اماں بی کی بڑی پانچوں بہوؤں نے "رات کے اندھیرے" کا خطاب دے دیا تھا قطعاً "پسند نہیں تھی۔ اپنی عام سی شکل و صورت کی وجہ سے نہیں اور نہ ہی دولہن صاحبہ کی کم تعلیم ناپسندیدگی کی اصل وجہ تھی۔ بات تو کچھ یوں تھی کہ اب صدا کی کام چور چوچک کو دوگنا کام کرنا پڑتا تھا اور نئی دولہن اپنے وجیہہ سے شوہر پر توجہ دینے کی بجائے ہمہ وقت چوچک کو نگاہوں کی زد میں رکھتی تھی۔

اب بھی ملشہ اپنی زیر نگرانی چوچک سے برتن دھلوا رہی تھی۔ ایک ایک دیگچی' پتیلے اور کڑاہی کو اچھی طرح منجھوانے کے بعد اس نے ایک صاف کپڑا چوچک کی طرف بڑھایا اور بولی۔

"انہیں اب اچھی طرح رگڑ کر خشک کرو تاکہ برتنوں پر پانی کے چھینٹے نما داغ نظر نہ آئیں۔" چوچک

digest library.com

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے
آسیہ سلیم قریشی کے 3 دلکش ناول

کتاب کا نام	قیمت
وہ مجھلی سی دیوانی سی	450/- روپے
آرزو نکھر آئی	400/- روپے
تھوڑی دور ساتھ چلو	400/- روپے

ناول منگوانے کے لئے فی کتاب ڈاک خرچ 45/- روپے

منگوانے کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32735021

کو ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ وہ سبزی بنانے کا کام بھی تیزی سے سرانجام دے رہی تھی۔ اسے لنچ وقت سے پہلے تیار کرنا تھا تاکہ بچے اور بڑے انتظار کی کوفت سے بچے رہیں۔

"ملیحہ باجی! آج کیا پکانے کا ارادہ ہے۔؟" چوچک زیادہ دیر کہاں خاموش رہ سکتی تھی۔ اور پھر ملیحہ کو فریزر میں سے گردے' دل اور بھیجے کے علیحدہ علیحدہ پیکٹس کو نکالتے دیکھ کر اس کی چٹخارے لیتی زبان سے رہا نہ گیا تو پوچھنے لگی۔

"مونگ کی دال' کھیے کا رائتہ اور شاہجہانی کٹاکٹ۔" ملیحہ نے دیگچی چولہے پر چڑھا کر کیبنٹ سے آئل کی بوتل نکالی۔

"تو پھر یہ گردے' دل اور بھیجے کا کیا کرنا ہے۔" چوچک کچھ بدمزا سی منیو کو سن کر بولی۔

"شاہجہانی کٹاکٹ بناؤں گی۔"

"اچھا۔ اچھا۔" وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

"سچ کہوں باجی! جب سے آپ اس گھر میں آئی ہیں قسم سے کھانے کا سواد آگیا ہے۔ ورنہ یہاں تو ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب ہوٹل سے روٹی یا سالن نہ منگوایا گیا ہو۔ اتوار کے اتوار بڑی بھابھیوں کو فرصت نصیب ہوتی تھی اور اس چھٹی والے دن ان کے سو کام ہوتے تھے اور سب سے بڑھ کر اوپر والی ساری "بھابھیاں" پورے ہفتے کی نیند چھٹی والے روز ہی پوری کرنے کے چکر میں سارا سارا دن نیچے نہیں اترتی تھیں۔ بارہ بجے تک بچے بھوک بھوک چلاتے خود ہی ٹافی چنے لینے نکل پڑتے۔ یا کبھی کبھار منہ پھٹ بھائی چائے بنا دیتے یا توس سینک کر بچوں اور اماں بی کے سامنے رکھ دیتے۔

اتوار کے دن بھی گھر کا کھانا کہاں نصیب ہوتا تھا۔ اوپر والی چاروں بھابھیوں کی ڈیوٹی تھی۔ ہر اتوار کو ایک بھابھی اپنا پرس کھول کر بازار سے دونوں وقتوں کا کھانا منگواتی تھیں۔ اماں بی کو بازاری کھانوں کی وجہ سے معدے کی تکلیف ہو گئی ہے۔" چوچک راز داری سے تفصیلاً بتانے لگی تھی۔

"کچن میں کھڑے ہو کر پکانا کہاں آسان ہے۔ اور اوپر والی بھابھیاں ہیں ہی آرام طلب۔"

"زمین سے پانی اس لیے ختم ہو رہا ہے کہ تم جیسے لوگ پانی کی قدر نہیں کرتے برتنوں کو صابن لگاتے وقت ٹونٹی کو بند کر دیا کرو۔" ملیحہ نے ناراضی سے اسے ٹوکا تو وہ اور بھی زیادہ مزا ہو کر برتن رگڑنے لگی۔

"ایک تو ملیحہ باجی کو تعریف اور خوشامد بھی خوش نہیں کرتی۔" چوچک جل بھن کر سوچتی رہی۔

"اف روزانہ ہی اتنے برتنوں کا ڈھیر جمع ہو جاتا ہے۔" برتن پتیلے اٹھا کر اسٹور میں لے جاتی چوچک جلتی کلستی رہی۔ اس پل وہ بھول چکی تھی کہ مزے دار سنہرے سنہرے بادامو والے حلوے اور کم مرچوں والے پھولے پھولے سفید چنوں کے خوش ذائقہ سالن کے "سواد" کی وجہ سے برتنوں کا ڈھیر جمع ہوا ہے۔ پہلے پہل بازاری سالن' وغیرہ دیوں میں بند آتے تھے سو کاموں میں اس کے لیے سو طرح کی سہولتیں تھیں مگر اب۔ چوچک تریوڑ جتنا منہ سجائے ملیحہ کی ہدایت کے مطابق جالے اتارنے لگی۔

اماں بی قمر سلطانہ کا یہ سبزہ زار کی کالونی میں بنا پانچ منزلوں پر مشتمل کوٹھی نما مکان کچھ کچھ جدت لیے ہوئے تھا۔

وہ پڑھی لکھی معاملہ فہم خاتون تھیں۔ شوہر بھی اعلا تعلیم یافتہ تھے۔ گھر میں بہت خوشحالی تھی۔

شوہر کو بیٹی کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کے پیش نظر ان کے ہاں سات بیٹوں کی ولادت ہوئی۔

منیر' معراج' منہاج' مکرم' موسیٰ' موثق اور مہد یار' سات صحت مند اور ذہین بیٹوں کی ماں بن کر بھی وہ عجز و انکساری کا پیکر تھیں۔ بچے ذہین تھے سو انہوں نے تعلیم کے معاملے میں والدین کو مایوس نہیں کیا تھا۔

منیر کو دوہا میں جاب مل گئی تو دادی کو سب سے بڑے پوتے کو بیاہنے کا شوق ہوا۔ آناً فاناً لڑکی پسند کی گئی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا حساب ہوا۔ منیر کو

پاکستان بلوایا گیا۔ ادھر لڑکی والے بھی گویا تیار بیٹھے تھے۔ شادی ہوئی۔ بارات گئی بڑی شان و شوکت سے۔ پہلی پہلی بہو تھی سو دادی ساس نے بھی جی بھر کر ارمان نکالے۔ بتیس تولے سونا اور نہایت شاندار بری تیار کروائی گئی۔ ولیمہ ہوا' پھر چوتھی کی رسم اور اس کے بعد ابھی دادی ساس اور قمر سلطانہ کے چاؤ پورے نہیں ہوئے تھے جب بہو بیگم نے اعلان کر دیا۔ وہ میاں کے ساتھ دوہا جانا چاہتی تھی۔

ان ساس' بہو نے دبی دبی آواز میں بیٹے کو سمجھانا چاہا۔ وہ سال دو سال صائمہ کو پاس رکھنا چاہتی تھیں مگر صائمہ نے نہ جانے کیا کیا میاں کے کان میں پھونک رکھا تھا۔ اس نے ماں اور دادی کی ہدایات گویا چٹکیوں میں اڑا دی۔ صرف تین مہینے بعد صائمہ دوہا چلی گئی تھی۔ محبوب صاحب نے بیٹے کے اس عمل پر نہ تنقید کی نہ تعریف۔ حالانکہ انہیں بھی بہو سے بیٹیوں والے "سکھ" کی خواہش تھی۔

بہرحال بیٹے کی خوشی ان ساس بہو کو بھی مقدم تھی۔ اسی طرح کچھ وقت مزید سرک گیا۔ منیر کے پانچ سال میں تین بیٹے ہوئے۔ ادھر محبوب صاحب اپنی والدہ اور بیوی پر نہ بھروسہ کرتے ہوئے منہاج اور معراج کے لیے اپنے دیرینہ دوست خوشی محمد کی بیٹیوں کو پسندیدگی کی سند بخش آئے۔

پہلی بہو ان کی والدہ کی پسند سے آئی تھی۔ دوسری دونوں کو وہ خود پسند کر کے بالا ہی بالا تمام معاملات طے کر آئے۔ اس دفعہ پھر قمر سلطانہ دل مسوس کر رہ گئیں۔ اپنی پسند سے بہو لانے کا ارمان دل کے نہاں خانوں میں دبا کر شوہر کی رضا میں راضی ہو کر ایک دفعہ پھر جوش و خروش سے بری کی تیاریاں کرنے لگی تھیں۔

منیر سے شادی کے سلسلے میں رابطہ کیا تو اس نے اپنے ذاتی اخراجات کی طویل ترین دکھ بھری داستان سنائی کہ اماں کی آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔ ان کا بیٹا پردیس میں تنہا' اکیلا پریشان تھا سو انہوں نے اپنی طرف سے بیٹے کو نہ پریشان کرنے کا عہد کر کے خون

دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

نومبر 2010 کے شمارہ کی ایک جھلک

بے سحر رات کے مسافر

اسلم راهی کے قلم سے تاریخ کے اوراق۔

سحر زادی

ایک حوصلہ مند نوجوان کی داستان۔ سبحان راشد کے قلم سے۔

کارواں

ایم اے راحت کے قلم سے۔

چار ملک...... چار کہانیاں

احمد صغیر صدیقی کے قلم سے۔

روشنی کا سراغ

آخری صفحات پر ایم اے راحت کی معاشرتی تحریر۔

☆ ملکی و غیر ملکی ادب سے انتخاب۔

☆ زندگی کے تلخ حقائق سے منتخب "سچی داستانیں"۔

نومبر 2010 کا تازہ شمارہ آج ہی خرید لیں

رکھ دیا۔ حالانکہ شادی کے بعد منیر نے کبھی مہینوں بعد ڈرافٹ، منی آرڈر یا کسی کے ہاتھ تھوڑی بہت رقم بھجوانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

معراج گورنمنٹ ملازم تھا۔ اس کی جاب بھی بہت اچھی تھی نادیہ بھی اسی محکمے سے وابستہ سرکاری آفیسر تھی۔

digest.library.com

منہاج مقامی کالج میں پروفیسر تھا۔ اور نائلہ محکمہ تعلیم میں اس وقت جونیئر آفیسر تھی بعد میں ترقی کی منازل طے کرنے کے بعد اس وقت وہ ڈپٹی ایجوکیشن کے عہدے پر فائز تھی۔ دونوں بہنیں بلا کی ذہین تھیں۔ اپنی "ذہانت" کا بروقت استعمال کرتے ہوئے سب سے پہلے تو انہوں نے دوسرے اور تیسرے نمبر والے پورشنز پر اپنا تسلط جمایا تھا اور بعد میں سسر صاحب سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ مزید بیٹوں کی شادی سے پہلے اوپر ایک اور منزل تعمیر کروالیں۔

اوپر والے دونوں پورشنز جدید طرز تعمیر کا شاہکار تھے۔ چار بیڈ رومز، اٹیچ باتھ، کچن، اسٹور، لاؤنج اور وسیع و عریض صحن نما بالکونیاں۔ محبوب صاحب بہوؤں کا اشارہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے اسی لیے انہوں نے بینک میں جمع شدہ رقم سے اوپر دو اور پورشنز تعمیر کروا دیئے۔

سب سے نیچے اماں بی رہائش پذیر تھیں۔ یہ والا حصہ اپنی جگہ بہتر تھا مگر جب لاؤنج سے اوپر کو جاتی سیڑھیوں سے نادیہ اور نائلہ کے پورشن کا ایک چکر لگانے کے بعد نیچے والا حصہ کافی پسماندہ سا لگتا تھا۔ نیا نکور، جہیز اور فل کارپٹڈ بیڈ رومز۔ یوں لگتا گویا کسی سپر لگژری کشادہ سے فلیٹ میں قدم رنجہ فرمالیا ہے۔ اوپر والے لاؤنج، خوب ڈیکوریٹڈ تھے۔ دبیز کارپٹ، اسٹائلش سے گلدان اور سیزیاں۔ ٹی وی، شوکیس میں سجی کتابیں۔ ایک ٹھنڈا ٹھنڈا سا فرحت بخش احساس سرشار سا کردیتا تھا۔

صائمہ جہیز نہیں لائی تھی۔ شاید وہ بننے سے ہی اِن نہ رہنے کے ارادے سے آئی تھی۔ سو نیچے ماں بی کا پرانا اور بدوضع سا سامان پڑا تھا۔ لکڑی کے بھاری پایوں والے پلنگ، چارپائیاں اور لاؤنج میں رکھا تحت نشستی سے ویلوٹ کا پرانا صوفہ، دو کرسیاں اور ایک لکڑی کی سولہ کرسیوں والی میز۔ یہ میز اپنی چمک دمک قائم رکھے ہوئے تھی۔ شاید اس لیے کہ یہ میز اماں بی کے جہیز کی نہیں تھی۔

...... لیے بڑی اماں (ساس) اپنی نواسی بسمہ کو لے آئیں تب بھی قمر سلطانہ کی خاموشی نہ ٹوٹی وہ اپنی فرمانبرداری پر کوئی حرف لانا نہیں چاہتی تھیں۔ ساس اچھی صورتوں پر فدا ہو جاتی تھیں سو اس لیے ان کے آنگن میں کافی حسین چہرے جلوہ افروز تھے۔

نہ جانے یہ خوش قسمتی تھی کہ بدنصیبی، ان کی ساری بہویں ملازمت پیشہ تھیں۔ بسمہ نے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنا ذاتی بوتیک اسٹیبلش کرلیا۔ اور مصروف سے مصروف تر ہوتی چلی گئی۔ بڑی اماں بہوؤں کے رنگ ڈھنگ سے دلبرداشتہ ایک رات سوئی تو پھر نہ اٹھ سکیں۔ پوتوں کی بیویوں سے خدمت کروانے کا ارمان لیے بے چاری آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ اماں بی کو ساس کا بہت سہارا تھا۔ ان کے دم سے اماں بی کا دل بھی لگا ہوا تھا مگر اب وہ تھیں اور اتنے بڑے بھاں بھاں کرتے گھر کی تنہائیاں۔

شوہر کی وفات کے بعد وہ اور بھی کم گو ہوتی چلی گئیں سب سے چھوٹا مہد ان دنوں کراچی میں اپنی نانی کے پاس رہائش پذیر تھا۔ دراصل قمر سلطانہ مہد کی دفعہ بہت بیمار ہو گئی تھیں۔ تبھی ان کی والدہ ننھے مہد کو لے کر کراچی چلی گئیں۔ مہد بہت ذہین اور لاابالی طبیعت کا کھلنڈرا سا نوجوان تھا۔ پڑھائی کے علاوہ اس کی اور بھی بہت سی مصروفیات تھیں نانی کے گھر اسے بہت توجہ اور محبت ملی تھی یہ خاص اہمیت اور بے تحاشا چاہت اسے بے حد مغرور کرتی چلی گئی۔ اکلوتی ماموں اور ان کی لاڈلی دختر نازنین دونوں ہی مہد کو خاص توجہ سے نوازتی تھیں اور وہ بھی نازنین کے حسن پر فریفتہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس اونچی ناک کی وجہ سے اس نے کبھی اظہار کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

موسی نے ایک دوست کی شراکت کے ساتھ بزنس اسٹارٹ کرلیا تھا۔ دنوں میں اس کے بزنس نے خوب پھلنا پھولنا شروع کردیا۔ انہی دنوں منیر اور صائمہ کی ایک حادثے میں انتقال کی خبر نے اماں بی کو توڑ کر رکھ دیا۔ بدقسمتی تو یہ تھی کہ وہ بیٹے اور بہو کا آخری دیدار بھی نہیں کرسکی تھیں دو مہینے بعد منہب' علیم' ملت اور ماتیہ کو موسیٰ واپس لے آیا تھا بچوں کے ننھیال والوں نے اس معاملے میں صاف جھنڈی دکھا دی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے سرک رہا تھا۔ موسی نے ماں کو لڑکی ڈھونڈنے کے مشکل اور تکلیف دہ مرحلے سے گزرنے نہیں دیا اور خود ہی اپنے بزنس پارٹنر کی بہن سونیا کو بیاہ لایا یہ اور بات ہے کہ سونیا دولہن بنی سیدھی اپنے فلیٹ میں جا پہنچی۔

خیر سے سونیا کی شادی کو بھی اب تو آٹھواں سال لگ تھا۔ اس کے بھی تین بیٹے تھے۔ منیر کی بیٹی فی الحال اماں بی کی اکلوتی پوتی تھی۔ شاید اسی لیے ماتیہ انہیں سب بچوں میں زیادہ عزیز تھی۔ تانیا اس نے کالج جانا شروع کیا تھا۔ تکو کتابیں' یونیفارم' شوز' اور دیگر اخراجات پر کافی رقم اٹھ گئی تھی جس کی وجہ سے اماں بی کی تجوری بھی خالی ہو چکی تھی۔ سب بیٹے چند ایک ہزار مہینے کے شروع میں بچوں کے اخراجات کے لیے اماں کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ گھر کا راشن اماں بی کی پینشن سے آتا تھا۔ سب کے لیے کھانا نیچے ہی پکتا۔ مگر مجال ہے جو ایک دن بھی کسی بہو نے نیچے آکر اکٹھے کھانا کھانے کی کوشش کی ہو۔ دفتروں سے آنے کے بعد دو منٹ کے لیے رک کر اماں بی کی خیریت پوچھنے کے بعد جوں ہی وہ اوپر جاتیں تو پھر بچے صبح ناشتے کے وقت ہی ان کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔

جب تک اماں بی میں ہمت تھی بڑے شوق اور اہتمام سے دیگ نما دیگچی میں دونوں وقتوں کا کھانا پکاتیں۔ اپنے ہاتھوں سے نرم نرم پھلکے اتارتیں۔ بچوں کی فرمائشیں پوری کرتیں۔ آلو کے چپس' مٹریاں' اور اخروٹ کی ٹافی بنا کر رکھ لیتی تھیں اسکول سے آنے کے بعد بچے سیدھے دادی کے پاس آجاتے تھے۔ پھر بچوں کی ماؤں کو احساس ہوا کہ ان میں منیرز اور آئی کٹیس کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ بچے چھری' کانٹے کا استعمال بھولتے جارہے ہیں۔ تبھی بچوں کے نیچے آنے پر پابندی عائد ہوگئی۔ اب وہ صرف مخصوص وقت میں باہر کھیلنے کی غرض سے دادی کے پاس آتے تھے۔ ویسے بھی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی ترجیحات بھی بدل رہی تھیں۔

گھر کے کاموں کے لیے پہلے چوچک کی ماں چاندنی آیا کرتی تھی۔ جب سے اسے ٹی بی کا مرض لاحق ہوا تھا نادیہ اور نائلہ نے چاندنی کے گھر آنے پر بین لگا دیا۔ اماں بی کے دبے دبے اعتراض پر وہ دونوں بہنیں ہی انہیں قائل کرنے کی غرض سے میدان میں کود پڑیں۔

"اماں بی ٹی بی تو اچھوت کی بیماری ہے۔ کھانس کھانس کر سارے گھر میں تھوکتی رہتی ہے۔ بیس سال تک اس تھوک کے جراثیم جگہ نہیں چھوڑتے۔ بچے تو ہوتے ہی بہت حساس اور نازک ہیں۔ جلد اثر قبول کرلیتے ہیں۔"

"لو یہ کیا بات ہوئی۔" اماں بی بہو کی نرالی منطق سن کر خفا ہوگئیں۔

"بہرحال چاندنی کو اب کام پر آنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ چوچک کو بھی رہنے دیں۔ مجھے تو وہ بھی دمے کی مریضہ لگتی ہے۔ میں نے تو ہاشمی صاحب کی ملازمہ بانکی کو دو ہزار ماہوار تنخواہ پر رکھ لیا ہے۔" نائلہ نے ناک چڑھا کر اطلاع دی۔

"دو ہزار۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔" اماں بی نے دہل کر کہا۔ "چوچک بے چاری بارہ سو میں پورے گھر کا کام کرتی ہے۔"

"اب اماں بی مہنگائی بھی تو دیکھیں نا۔ اور پھر بانکی ہے بھی تو بانکی چھبیلی۔ صاف ستھری' سمجھدار اور روزانہ نہا کر آتی ہے۔ بچے بھی خوش ہیں۔" نادیہ نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ وہ ان کی سب بہوؤں میں زیادہ سنجیدہ مزاج اور بردبار تھی۔

"لولی لی! اگر ساس کو بھی ٹی بی یا دمہ ہو گیا تو کیا مجھے بھی اٹھا کر باہر کرو گی۔ ایسی بھی کیا نزاکتیں۔" اماں بی کا غصہ کسی طور کم نہ ہوا۔ ویسے بھی بڑھاپے کی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ کافی روکھے مزاج کی ہوتی جارہی تھیں۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے کہ چوچک ہی نیچے والے پورشن میں کام کرے گی۔ تم لوگ اپنی من مانیاں کرتی پھرو۔"

"یوں کریں چاچی! اخبار میں ایڈ دے دیں کہ ہمیں ایک عدد صاف ستھری' خوبصورت' پڑھی لکھی تمام بیماریوں سے پاک صاف میڈ کی ضرورت ہے۔ براہ مہربانی ضرورت مند ملازمائیں مندرجہ بالا خوبیاں اگر خود میں پائیں تو اس ایڈریس پر رابطہ کرلیں۔" منہب دادی کے کپڑوں کو جما جما کر استری کرتے ہوئے مزے سے بولا۔

"ایڈ میں ان دو سطروں کا بھی اضافہ کرلیں کہ میڈ بکل چیک لیپ لازمی کروانا ہے۔ ورنہ ہمارے گھر میں ایک عدد ڈاکٹر موجود ہے۔ رپورٹس غلط دکھا کر بے ایمانی کی گئی تو الٹا لٹکا دیا جائے گا۔" ملہت نے بھی ٹانکا جوڑا۔ چوچک آج چھٹی پر تھی۔ سومیم اور مانیہ دونوں صفائی ستھرائی میں مصروف تھے۔ دونوں نے چھوٹے منہ بھی اپنی اپنی کام والی کو نیچے بھیجنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ بلکہ کافی غصے کے عالم میں تائلہ اٹھ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"چاچی! آج دوپہر کا کھانا بنانے کی ڈیوٹی آپ کی ہے۔" مانیہ جھاڑو پکڑے اسٹور سے برآمد ہوئی۔

"میں نے تو مشین لگا رکھی ہے۔ بچوں کے کپڑے ٹیلر کو دینے جانا ہے۔ میری امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ سوچا تھا آج کھڑے کھڑے امی کا حال چال پوچھ آؤں گی۔" تائلہ کو اور بھی بہت سے کام یاد آنے لگے تھے سو تفصیل سنانے کی غرض سے دوبارہ نیچے آگئی۔

"تو اس کا مطلب ہے آج پھر نان اور کباب کھانے پڑیں گے۔" ملہت نے منہ بنا کر کہا۔

"ایک بات کہوں دادی!" منیم ڈسٹنگ کرتے ہوئے پرسوچ آواز میں بولا۔

"بولو' جتنا مرضی بولتے رہو۔ یہاں کسی پر اثر نہیں ہوگا۔" اماں بی بے زاری سے تخت پر لیٹ گئیں۔

"آپ موثق چاچو کی شادی کسی کام والی سے کروادیں۔ ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے ایک تو مفت میں کام اور دوسرے بڑی چاچیوں کی طرح کم از کم نخرے تو نہیں دکھائے گی موثق چاچو کی بیوی۔" منیم نے اپنی عقل کے مطابق نہایت احمقانہ بات کی تھی۔

"ماشاء اللہ' میرے بھتیجے نے کیا خوب سمجھ داری کی بات کی ہے۔ میرا اسٹینڈرڈ تو ان نوکرانیوں تک محدود ہے نا۔" موثق اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔

"یوں کرو۔ اپنے مہد چاچو کے لیے اس بارے میں سوچو۔ کیا پتا وہ تم لوگوں کی خواہش پوری کردے۔"

"ہرے۔ اس مہد کو دیکھو' آٹھواں دن ہے آج اور اس نے کوئی فون نہیں کیا۔" اماں بی ایک دم پریشانی سے اٹھ بیٹھیں۔

"منہب! ذرا کراچی کال تو ملا دو۔"

"اس وقت تو مہد آفس میں ہوگا۔" موثق نے لاپرواہی سے بتایا۔

"آفس۔" اماں بی حیران رہ گئیں۔

"مہد نے تو نوکری کرلی۔ اور مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"دو ماہ ہو چکے ہیں اسے جاب کرتے ہوئے۔ بڑی اچھی جاب ہے اس کی' آفس کی طرف سے گھر اور گاڑی کی سہولت بھی ملی ہے۔ مالی اور نازنین پرانا مکان چھوڑ کر مہد کے ساتھ رہ رہی ہیں۔" موثق نے اماں بی کی حیرانی دور کرنا چاہی۔

"مہد چاچو نے تو نہیں بتایا۔" مانیہ خوشی سے چہکتی ہوئی کام چھوڑ کر آگئی۔

"مہد نے کب فارمیلٹیز نبھائی ہیں۔ بہرحال ہماری طرف سے بھی مبارکباد دے دیجیے گا۔" تائلہ بھابھی جاتے جاتے رک کر معنی خیزی سے کہتی ہوئی چلی گئی۔ اماں بی سوچوں میں گم خاموش بیٹھی تھیں۔ وہ پریشان اس لیے نہیں تھیں کہ ثریا اور نازنین مہد کے

ساتھ کیوں رو رہی ہیں بلکہ انہیں مہد کے رونے نے تکلیف دی تھی۔ "مہد نے کیوں مجھے بے خبر رکھا" یہی بات انہیں مضطرب کر رہی تھی۔

مہد کو اپنی ماں کے حوالے کر کے وہ مطمئن ہو چکی تھیں مگر انہوں نے اپنے بیٹے کو کسی پر بوجھ بننے نہیں دیا تھا۔ ایک مخصوص رقم وہ مہینے کے شروع میں کراچی بھجوا دیا کرتی تھیں۔

یہ سلسلہ ان کی والدہ کی بیماری کے دوران اور وفات کے بعد تک بھی جاری تھا۔ ابھی پچھلے مہینے انہوں نے سات ہزار روپے کراچی بھجوائے تھے۔ اگر مہد کو جاب مل گئی تھی تو پھر اسے وہ رقم اپنے پاس نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ کیا اسے نہیں پتا تھا کہ ان پر چار بچوں کی ذمہ داریاں ہیں اور اس کے بھائی چند ایک نوٹ پکڑا کر اپنا فرض ادا کرنے کے بعد پوچھتے تک نہیں۔ ابھی وہ انہیں سوچوں میں گم بیٹھی تھیں جب مہد کا فون آگیا۔

"کیسی ہیں آپ؟ طبیعت ٹھیک ہے؟ میں کچھ دن تک چکر لگاؤں گا۔ بچے ٹھیک ہیں؟ میں نے ناظر کے ہاتھ کچھ پیسے بھجوائے ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے گا۔"

"کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تو یہ بتاؤ کیری لگ گئی ہے کیا۔" اماں بی کی آواز میں خوشی بھی تھی اور ناراضی بھی۔

"جی اماں۔"

"تو نے بتایا نہیں۔" شکوہ لبوں پر مچل ہی گیا۔

"میں خود آکر آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ موثق نے میرے سرپرائز کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔"

"کب آؤ گے۔" اماں بی نے پوچھا۔

"چند دن تک آؤں گا۔ ثریا مامی کا چیک اپ کروانا ہے۔ ڈاکٹر سے ٹائم لے رکھا ہے۔" اس نے تفصیلاً بتایا۔

"میری طرف سے بھی پوچھنا ثریا کو۔ اور بیٹے آکر ماں کو صورت دکھا جاؤ اپنی نہ جانے آخری پسر کا یہ چراغ کب گل ہو جائے۔ میں نے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ یہ لو مانیہ بے چین ہے پہلے اس سے بات کرلو۔" اماں بی نے کندھے سے لٹکتی مانیہ کے ہاتھ میں ریسیور تھمایا اور نم پلکوں کو پونچھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"کہاں جانے کی تیاری ہے؟" نازنین نے کمرے میں جھانکا۔

"یہ دو تین شرٹس تو پریس کر دو۔" نازنین کو دیکھ کر اسے فوراً کام یاد آجاتے تھے۔

"لاؤ ادھر۔" نازنین کمرے میں آگئی۔ بیڈ پر کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ مہد اپنی ٹائیاں، رومال اور جرابیں وغیرہ علیحدہ علیحدہ کر کے رکھ رہا تھا۔ اس کے کپڑے لانڈری سے دھل کر آتے تھے البتہ پریس وہ خود کر لیتا تھا۔ حالانکہ نازنین نے چھوٹی سی عمر سے اس کے تمام کاموں کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی۔

"کب واپسی ہوگی۔" نازنین سمجھ چکی تھی کہ مہد کہاں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔

"تقریباً ایک ہفتہ تو رہوں گا۔ بچے بہت مس کر رہے ہیں۔"

"میں ایک بات سوچ رہی تھی۔" نازنین شرٹس پریس کرنے کے بعد کمرے کا پھیلاوا سمیٹتے ہوئے بولی۔

"صرف سوچا ہے، کہا کیوں نہیں؟" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ اب نازنین اس کی پیکنگ کر دے گی۔

"تم پھوپھو اور بچوں کو یہاں کیوں نہیں لے آتے۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا۔

"بھئی تمہاری جاب ادھر ہے۔ سال دو سال تک تم یہاں رہو گے۔ تو بہتر نہیں کہ روز روز آنے جانے کے چکروں سے نجات مل جائے گی۔ تمہارے لیے بھی آسانی ہو گی۔"

"اور اس فلیٹ میں اتنے لوگ کیسے سمائیں گے۔ ایک کمرہ میرے پاس ہے اور ایک تمہارے اور امی

کے پاس، ذوہیب ڈرائنگ روم میں سوتا ہے۔ جبکہ اماں تو اس ڈربے کو دیکھ کر گھبرانے لگیں گی۔"

اس نے بڑے اطمینان سے اس سپر لگژری فلیٹ کو ڈربے کا نام دے دیا تھا۔ فلیٹ بہت اچھی جگہ پر تھا۔ مگر بیڈ روم صرف دو ہی تھے۔ ایک فیملی باآسانی رہ سکتی تھی۔

"میں بھی چلوں تمہارے ساتھ۔ پھوپھو سے بھی ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔"

"اور مامی اکیلی رہیں گی۔" مہد نے طنزیہ کہا۔

"رجو سے کہہ دوں گی۔ وہ امی کے پاس رہ لے گی دو چار دن۔" اس نے فوراً "پروگرام ترتیب دے لیا۔

"اور تمہارا آفس۔"

"بھاڑ میں جھونکو۔" نازنین نے خفگی سے کہا۔

"صاف صاف منع کیوں نہیں کر دیتے۔"

"پھر کبھی لے چلوں گا۔" مہد نے پچکارا۔

"مہد! تم بہت برے ہو۔" نازنین کے گلابی چہرے پر خفت کے آثار نمودار ہونے لگے۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ اسے چڑاتے ہوئے کہنے لگا۔

"کیا؟" نازنین نے ناگواری سے بھنویں اچکائیں۔

"یہی کہ میں بہت برا ہوں۔ اور تم۔"

"ہاں۔ ہاں، میں کیا ہوں۔ بولو بتاؤ۔" وہ تنک اٹھی۔

"تم۔ تم بہت اچھی ہو، سب سے اچھی۔" مہد کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ تھی۔ نازنین کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"جلدی آجانا۔" وہ تاکید کرنا نہیں بھولی تھی۔

"او کے جناب۔" مہد کورنش بجا لایا۔

"اس شاپر میں کیا ہے۔" نئے نکور شاپنگ بیگ پر نازنین کی نظر پڑی تو پوچھنے لگی۔

"ماتیہ، منہب اور میم کے کپڑے ہیں۔" وہ مصروف سے انداز میں بولا۔ اسی صبح وہ چلا گیا تھا۔ ثریا نے اس کے جانے کے بعد بیٹی سے کہا۔

"تم بھی ساتھ چلی جاتیں۔"

"مہد آپ کی وجہ سے نہیں لے کر گیا۔"

"ہوں۔ ماشاءاللہ سے بڑا خیال رکھتا ہے ہمارا۔ ہم نے بھی تو اولاد سے بڑھ کر چاہا ہے۔" ثریا کے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ تھی۔ ایسے ہی بیٹوں جیسے داماد کی تو انہیں چاہ تھی۔

"تم نے بات کی مہد سے۔"

"ایک ہزار ایک مرتبہ تو کر چکی ہوں۔"

"کیا کہتا ہے وہ۔" ثریا نے کچھ پریشانی کے عالم میں بیٹی کا چہرہ ٹٹولا۔ شاید اس کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگانا چاہ رہی تھیں۔

"کہہ رہا تھا ستائیس سالوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ شادی کے بارے میں جب بھی سوچا ہے تمہارا ہی چہرہ ذہن کی اسکرین پر جگمگانے لگتا ہے۔ مگر اماں کی رضامندی زیادہ ضروری ہے۔" نازنین نے خوشدلی سے کہا۔

"تو اسے کہنا تھا نا آپا سے بات کرلے۔ میرا ارادہ جلد از جلد تمہاری شادی کرنے کا ہے۔ تم اور مہد یہیں رہو گے میں تو جہ بڑی آپا کے پاس چلی جاؤں گی۔ گھر کا کرایہ تو آ ہی رہا ہے۔" وہ مستقبل کی پلاننگ کر رہی تھیں اور ادھر لوح محفوظ پر کچھ اور لکھا جا چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

سید پور سے ایک میل دور دریائے ٹوچی ٹھاٹھیں مار رہا تھا یہ بجوہت کا علاقہ تھا۔ بارڈر کے پاس اس کا پسماندہ سا گاؤں۔ وہ اکیس سال بعد اپنے گاؤں اماں کی وفات پر آئی تھی۔ بہت بچپن میں تائی نے اسے گود لے لیا تھا۔ اسی لیے زندگی کا ایک بڑا حصہ ولو کینٹ میں گزرا تھا۔ تایا فوج میں ملازم تھے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد بھی انہوں نے گاؤں کا رخ نہیں کیا تھا۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ تائی نے اپنی بہن کے ایک بیٹے کو بھی فرزندی میں لے رکھا تھا۔ کاظم ان دنوں کویت میں ملازمت کی غرض سے مقیم تھا۔ تایا، تائی کو اس نے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔

digest library.com

جانے سے پہلے تایا اس کی شادی کردینا چاہتے تھے مگر ان کی اچانک وفات کی وجہ سے تایا اور تائی نے خاموشی اختیار کرلی۔ ویسے بھی ان کی بے انتہا کوششوں کے باوجود کوئی مناسب رشتہ فی الحال ان کی نظر میں نہیں تھا۔ تائی بہت پریشان تھیں۔ اس پریشانی میں ان کی سیٹ کنفرم ہوگئی اور وہ دونوں ڈھیروں دعائیں دے کر پردیس کے لیے رخصت ہوگئے تھے۔ اس نے انہیں ہر طرح سے اطمینان دلایا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ اور باشعور لڑکی تھی کہیں بھی جاب کرکے خود کو مصروف رکھ سکتی تھی۔ مگر تائی مطمئن نہیں تھیں جبھی تو انہوں نے جانے سے پہلے اپنی کسی کزن کو خط لکھ کر نہ جانے کون کون سی داستانیں سناڈالی تھیں۔ ابھی تک جوابی خط موصول نہیں ہوا تھا۔ وہ منڈیر کی دیوار سے ٹیک لگائے سوچوں میں گم بیٹھی تھی تبھی پھوپھی کی آواز سنائی دی۔

"چندا! او چندا۔"

"کیا ہے پھوپھی؟" اس نے منڈیر سے نیچے جھانکا۔

"شام کا سماں ہے۔ نیچے آجا۔" پھوپھی نے پچکارا۔

"اسے بھوت پریت کا کیا خدشہ' یہ کون سا حور پری ہے۔" اس کی پھوپھی زاد نے طنزیہ کہا تھا اور پھر قل قل ہنسنے لگی۔ چندا ایک دفعہ پھر سوچوں کے بھنور میں ڈوبنے ابھرنے لگی تھی۔ دور بہت دور جموں کے پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرف کے آسمان کا رنگ کسی قدر سرخی مائل سیاہ تھا۔ اونچے اونچی مٹی کے ٹیلوں پر ننگ دھڑنگ بچے اچھل رہے تھے۔ اسے بچے بہت اچھے لگتے تھے۔ گندے' ستھرے' گورے' سانولے' ہر طرح کے بچوں کو دیکھ کر اس کے دل میں عجیب سی محبت کا طوفان امڈنے لگتا تھا۔ ہر لڑکی کے اندر ماتا چھپی ہوتی ہے۔ اسے لگتا تھا اس کے دل کا پیالہ کچھ زیادہ ہی ممتا سے لبریز ہے۔

واہ کینٹ میں وہ محلے کے بچوں کو مفت ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ اپنے جیب خرچ سے مونگ پھلی' ٹافیاں' نمکو کے پیکٹ خرید کر رکھ لیتی اور پھر وقتاً فوقتاً ان بچوں میں بانٹ دیا کرتی۔ اور جب وہ اس کے گال پر پیار کرکے نرمی سے بولتے۔ "چندا آپا! آپ بہت اچھی ہیں۔" تو اس کی آنکھیں محبت کے اس مظاہرے پر چھلکنے لگتیں۔

اسے بہت کم رشتے میسر آئے تھے۔ اور جو تھے اب وہ بھی پاس نہیں تھے۔

"چندا آپا! چندا آپا۔" مکان کے پچھواڑے سے آواز آئی تھی۔ راول اسے بلا رہا تھا۔ چندا نے دوپٹہ سر پر جماکر نیچے جھانکا۔

"کیا ہے راول۔"

"آپا! بیر لے لوں؟"

"اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔"

"آپ خود ہی تو کہتی ہیں جو بھی کام کرو بڑوں سے پوچھ کر کرو۔" راول مدبر بنا۔

"اچھا اچھا۔ اس وقت بیر نہ ہی توڑو تو بہتر ہے۔"

"کیوں آپا۔"

"درختوں کو اس وقت نیند آجاتی ہے۔" چندا نے اسے سمجھانا چاہا۔

"درخت بھی سوتے ہیں؟" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔

"درخت سنتے بھی ہیں' سانس بھی لیتے ہیں۔ صرف بول نہیں سکتے۔"

"یہ بیری کا درخت ہماری باتیں سنتا ہے۔" راول کو گویا یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں' اب تم گھر جاؤ۔ رات کے سائے بڑھنے لگے ہیں۔" وہ خود بھی کچی مٹی سے بنی سیڑھیوں کو پھلانگتی نیچے آگئی۔

پھوپھی دودھ میٹھا کررہی تھی۔ شمو چارپائی پر لیٹی تھی جبکہ بالا روٹی کھانے میں مگن تھا۔ مغرب کے فوراً بعد کھانا کھالیا جاتا تھا۔ اس کے بعد سونے کی تیاری' چاہے نیند آئے یا نہ آئے۔ چارپائی پر چادر تان کر لیٹنا ضروری تھا۔ اکثر سونے کی ایکٹنگ کرتے کرتے وہ تھکن سے چور ہوجاتی۔ جسم اکڑ جاتا۔ اور وہ کروٹ

بدلنے کی خواہش دل میں دبائے دبکتی رہتی۔ صبح کا آغاز منہ اندھیرے ہوتا تھا۔ پھوپھی بھی نماز کی پابندی کرتی تھی۔ اسی لیے چندا کو اپنے ساتھ ہی جگا لیتی۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ دونوں قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں پھر پھوپھی اپنے جانوروں کے ساتھ مصروف ہو جاتی۔ چارہ کاٹنا' دودھ دھونا' پانی بھرنا اور پھر مچھلی کا جال پکڑ کر دریا کی طرف نکل جانا۔ پھوپھی کے کاموں کی فہرست بہت طویل تھی۔ وہ اس کا دل بہلانے کی غرض سے اسے بھی ساتھ مصروف رکھتی۔

پھوپھی کا لوکاٹ کا کھیت تھا۔ پیڑ سے کچھ بڑے گول گول رس بھرے لوکاٹ اسے بہت پسند تھے۔ روزانہ پھوپھی ٹوکرا بھر کر لوکاٹ اتار کر لاتی اور پھر بالا شہر جا کر انہیں بیچ آتا۔ اکثر پیسے دینے کے معاملے میں وہ ڈنڈی مار جایا کرتا تھا۔

ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا لیے پھوپھی جب بڈی پسلی ٹوٹنے کے نتائج کی پروا کیے بغیر بالے کی کمر پر' ٹانگوں پر برساتی تو بالا خود بہ خود سچ اگل دیتا۔

"اماں! پپو کا قرض دینا تھا۔" اسے فلموں کا چسکا تھا۔ پپو کی دوکان پر بیٹھا سارا دن آنکھیں سینکتا رہتا۔

پھوپھی اپنے حصے کی دس مچھلیاں لائی تھی جو کہ ایک سو بارہ روپے کلو کے حساب سے بک گئیں۔

رسوئی میں سے بڑے مزے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ چندا رہو مچھلی کا سالن پکا رہی تھی۔ پچھلی مرتبہ شمو کے ہاتھ سے بنا سالن دیکھتے ہی گویا ابکائی آگئی۔ عجیب سی ناگوار بو اٹھ رہی تھی سالن میں سے کہ صدا کے ندیدے بالے نے بھی ہاتھ سے رکابی پرے کھسکا دی۔

پھوپھی سوہانجنہ اور چقندر کا اچار ڈالا رہی تھی۔ ایک کونڈے میں کٹے ہوئے کریلے اور لیموں رکھے تھے۔ راول کچے آم توڑ کر لایا تھا اور چندا آم کی چٹنی بنا رہی تھی۔ کچھ دور سکھ چین کی گھنی چھاؤں میں لگے تندور میں ماسی بختاں روٹیاں لگا کر سفید سفید کھن کی ڈلی ان پر رکھتی جاتی تھی۔

شمو نے پھوپھی کے کئی دفعہ جھاڑنے پر دسترخوان بچھا کر بالآخر برتن بھی چن ہی دیے چندا گھڑے میں سے تازہ پانی جگ میں ڈال کر لے آئی۔ پھر اس نے ٹھنڈے' میٹھے رسیلے آم کاٹ کر ایک ٹرے میں ترتیب سے قاشیں رکھ دیں۔ اسی پل لکڑی کے دروازے پر زور دار دستک ہوئی تھی۔ راول بھاگتا ہوا دروازے تک گیا۔ چندا بھی کچھ حیران سے پیونی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ یہاں دستک کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اس کی حیرانی فطری سی تھی۔ تبھی لاکھیا رنگ کا قیمتی نفیس سا سوٹ پہنے ایک بہت ہی سرخ و سفید رنگت کی اکہتر سالہ بوڑھی خاتون اندر داخل ہوئیں۔ ان کے پیچھے ایک کم عمر لڑکا اور ایک وجیہہ سا نوجوان بھی تھا۔

وہ خاتون پھوپھی سے اپنا تعارف کروا رہی تھیں۔

"میں قمر سلطانہ ہوں۔ افسر ممتاز کی سہیلی اور چچا زاد بہن۔ سلمٰی کو لینے آئی ہوں۔" چندا نے گھبرا کر لکڑی کے کواڑ کو تھام لیا۔ اس کے دل کی دھڑکن غیر معمولی رفتار سے چل رہی تھی۔

"نکاح۔ چندا آپا تیرا نکاح ہوگا۔ آج ابھی اور اسی وقت۔" بالا اور راول لڈی ڈال رہے تھے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ کیونکہ قمر سلطانہ نے دونوں کو ہزار ہزار کا ایک ایک نوٹ پکڑایا تھا۔

"دیکھ تو چندا! تیری ساس پوری تیاری سے آئی ہیں۔ کتنا پیارا جوڑا ہے اور دیکھ یہ سونے کا اصلی زیور۔" صدا کی نک چڑھی شمو کی زبان سے گویا شہد ٹپک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ کچھ رشک کی چمک لہرا رہی تھی۔ وہ بار بار سانولی سلونی' معمولی سے نقوش والی چندا کو بغور دیکھ رہی تھی۔ مائی نے بتایا تھا چندا نے ایم کام کر رکھا ہے مگر شمو کو تو قطعاً یقین نہیں آتا تھا کہ چند آپا اتنا ڈھیر سارا پڑھ کر آئی ہے۔ اس کی شخصیت ہی ایسی بجھی بجھی سی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا معمولی سا لباس' نہ رنگ نہ روپ نہ ہی ظاہری چمک دمک اور نہ ہی اعلا تعلیم پر اکڑ مغروری۔ وہ تو شکل سے

digest library.com

ہی پرائمری پاس لگتی تھی۔ یہ شمو کا ہی نہیں اس کی سہیلیوں کا بھی خیال تھا۔ اور اس کے اس ذاتی قسم کے خیال پر تصدیق کی مہر سلطانہ خالہ کے پوتے نے لگا دی تھی جو کہ اپنے چاچا کے کان میں کھسر پھسر کر رہا تھا۔

"چاچو یار! کہاں قسمت پھوٹ گئی ہے آپ کی۔ چاچی کی شکل دیکھ کر لگتا ہے گویا انہیں الف انار اور ب بکری کا بھی نہیں پتا۔ اتنی ہونق سی تو ہیں۔ مجھے تو یقین ہے انہوں نے اسکول کے درشن تک نہیں کیے۔" منہب روہانسا ہو رہا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ شہر کی پڑھی لکھی چاچیوں نے ان کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ یہ تو پھر گاؤں کی گنوار تھی۔ نہ جانے ان کا کیا حشر کرتی۔

اس نے تو دادی کی بھی بہت منتیں کی تھیں کہ اپنے ارادہ کو بدل لیں مگر نہ جانے دادی پر کون سی دھن سوار تھی۔ شاید بچھڑی سہیلی کی التجاؤں کا اثر تھا یا پھر برسوں پرانی دل میں چھپی اپنی پسند کی بہو لانے کا ارمان انگڑائیاں لے کر جاگ اٹھا تھا۔

آنا" فانا" گاؤں کی خواتین جمع ہو گئیں۔ مولوی صاحب تشریف لے آئے۔ نکاح ہوا۔ چھوارے بٹے اور مبارک سلامت کے شور کو سن کر منہب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر اپنی دوربین جیسی نظروں کو چاچو کے چہرے پر فٹ کر کے کچھ ناگواری، غصہ اور دکھ کے ملے جلے تاثرات ڈھونڈنے چاہے۔ مگر ایک سو بیسویں دفعہ بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ مہد کا چہرہ پہلے کی طرح سپاٹ تھا۔ منہب جل بھن کر رہ گیا۔ ماسی بختاں روح افزا والے دودھ سے مہمانوں کی تواضع کر رہی تھی۔ ایک گلاس مہد کی خدمت میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ مہد نے شائستگی سے معذرت کر لی۔ البتہ منہب کو مروتاً گلاس پکڑنا پڑا تھا۔ جوں ہی اس نے گلاس لبوں سے لگایا اسے زوردار ابکائی آنے لگی۔

"مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"تو رکھ دو۔ اتنا ندیدہ بننے کی کیا ضرورت ہے۔" مہد نے ڈپٹا۔

"آپ خاموشی سے بیٹھیں۔ دولہا بولتا نہیں۔"

"تسی بھائی صاحب دی بھرا ہو جی۔" کسی منچلی نے لہک کر پہلے سے جلے بڑے منہب سے پوچھا تھا۔

"نہیں، تمہیں کیا لگتا ہے۔ اٹھائی گیرا ہوں، چور اچکا ہوں۔"

"منہب!" یہ آواز دادی کی تھی جو کہ خشمگیں نظروں سے تنبیہاً اسے گھور رہی تھیں۔

"سوری دادی۔" وہ فوراً" جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"یہ میرا سب سے بڑا پوتا ہے۔" دادی اب انھی گولا گنڈا ای محترمہ سے منہب کا تعارف کروا رہی تھیں۔ اس کے ماتھے پر مزید دو بل نمودار ہو گئے۔

"یہ آپ کے ساتھ سراسر زیادتی ہے، ظلم ہے۔ آپ احتجاج کیوں نہیں کرتے۔" منہب مسلسل اسے بغاوت پر اکسا رہا تھا۔

"دادی کی جذباتی بلیک میلنگ کی نذر آپ کی یہ بانکی سی جوانی اور نجیلی سی عمر ضائع ہو گی۔" منہب کا تاسف کسی بھی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"میں تو بطور چاچی کبھی بھی انہیں قبول نہیں کروں گا۔ اور دیکھیے چاچو میں پہلے ہی آپ کو باور کروا رہا ہوں۔ اگر انہوں نے پنجابی فلموں کی ولن بن کر ہماری دادی کے خلاف یا ہمارے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی کی تو میں خاموش نہیں رہوں گا۔ مجھے تو ابھی سے مستقبل کے اندیشے دہلا رہے ہیں۔ دیکھیے گا آستینیں چڑھا کر سر پر کپڑا باندھے روزانہ فساد کھڑا کر کے رکھیں گی محترمہ۔ ہمارے گھر میں ایک جنگ کا آغاز ہونے والا ہے۔

اوپر والی چاچیاں تہذیب کے دائرے میں رہ کر صرف زبان سے نشتر چلاتی ہیں۔ یہ محترمہ ہاتھوں اور پیروں کا استعمال بھی بے دریغ کریں گی۔ ایک ہی وہ ہٹی اور وہ بھی کھوٹی۔ آپ سے زیادہ سمجھدار تو موتی چاچو نکلے ہیں۔ ہفتہ بھر پہلے ڈاکٹر مسکان کا ہاتھ تھامے گھر لے آئے۔ ان کے تعارف پر خوامخواہ سب پر لرزہ

طاری ہو گیا تھا۔ اب سوچتا ہوں انہوں نے اچھا ہی کیا ہے۔ آپ کی طرح بدھو نہیں بنیں وہ۔"

"ابھی بکواس بند کرو چھٹلے! گھر جا کر تیری انٹ شنٹ بکواس کا جواب دوں گا۔" مہد نے اس کے پاؤں پر اپنا پیر مارا۔

"یہ تلملاہٹ مجھ پر نہیں اپنی بیگم پر نکالیے گا۔" منہب جھلایا۔

"تم دونوں کیا بک بک کر رہے ہو۔" قمر سلطانہ نے ناراضی سے انہیں ڈپٹا۔

"کچھ نہیں دادی! چاچو سے نیگ کے سلسلے میں ڈسکشن کر رہا ہوں۔" وہ لوٹھا کر سیدھا ہوا۔ کچھ دیر بعد رخصتی کا شور اٹھا تھا اور مہد گہری سانس کھینچتا منہب کا ہاتھ پکڑے کھڑا ہو گیا۔

اس قدر ہنگامی شادی کے بارے میں اس نے کہاں سوچا تھا۔ وہ تو اماں کی محبت میں کشاں کشاں کراچی سے آیا تھا۔ اس کی آمد سے کوئی دو دن قبل اماں بی کو ایک خط موصول ہوا۔ بدقسمتی سے یہ خط اسی کے ہاتھوں ہی اماں تک پہنچا تھا۔ انہوں نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا۔ خط کا متن کچھ یوں تھا۔

"پیاری بہن قمر سلطانہ!" منہب نے دادی کے ہاتھ سے خط کو اچک لیا اور بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

"بہت عرصہ بعد تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ گردش ایام نے ایسے الجھایا ہے کہ خود اپنی بھی خبر نہیں رہی۔ تمہیں شاید اپنا وعدہ بھول چکا ہے۔ یاد کرو کراچی میں ان دنوں جب میرے میاں کا ٹرانسفر ہوا تو ہم مکان کی وجہ سے کس قدر پریشان تھے۔"

"آں۔ ہاں کیوں نہیں یاد۔ بھلا وہ وقت بھلایا جا سکتا ہے۔ اللہ بخشے اماں مرحومہ بھی اس وقت زندہ تھیں۔ افسر میرے ابا کی چچازاد بھائی کی بڑی بیٹی تھی۔ پہلے پہل بہت آنا جانا تھا پھر آہستہ آہستہ مصروفیات زندگی میں مگن ہو کر ملنا ملانا چھوٹ گیا۔

ہماری دانت کاٹے کی دوستی تھی اور افسر کی اماں اور میری اماں منہ بولی بہنیں۔ بہت عرصہ تک اس نے خط و کتابت کے ذریعے میرے ساتھ رابطہ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اپنی نااہلی کے باعث میں نے اس کے ایک خط کا بھی جواب نہیں دیا تھا۔ اور دیکھو اس کی محبت ابھی تک مجھے یاد رکھے ہوئے ہے۔" منہب کو پتا ہوتا "یہ یاد" کرنا صرف اور صرف دادی کی سہیلی کی "مطلب پرستی" کی ایک کڑی ہے تو کبھی بھی اتنے جوش و خروش سے خط پڑھ کر نہ سناتا۔ اوپر سے دادی سہیلی کی محبت میں پور پور ڈوبی آبدیدہ سی بیٹھی تھیں۔

"آگے بھی پڑھ کر سنا منہب!" دادی کی آواز رندھی سی محسوس ہوئی تھی منہب کو۔ اس نے ایک دفعہ پھر خط پڑھنا شروع کیا۔

"تین سال تک ہم اکٹھے رہے تھے۔ تم بھی ہر چھٹیوں میں بچوں کو لے کر آجایا کرتی تھیں۔ کتنا پیارا وقت تھا جو بیت گیا ہے۔ بجوٹ سے آم اور لوکاٹ کے ٹوکرے بھر بھر کر آیا کرتے تھے۔ میں چولائی اور سرسوں کا ساگ پکاتی تھی۔ تم باجرے کی روٹی بنا لیتیں اور سردیوں کی شاموں کا تمام تر گلابی حسن تمہارے ابا جی کے آنگن میں اتر آتا تھا۔"

"واہ۔ واہ کیا شاعرانہ قسم کا خط ہے۔" مہد جامن کھاتا ہوا سر دھننے لگا۔

"سرسوں کا ساگ، باجرے کی روٹی، مکھن کا پیڑہ اور سنہری سی دوپہر اور گلابی سی شام۔" فہیم بھی قالین پر گرتے ہوئے مسخرے پن سے بولا۔

"میرا تو تم کھانے کو دل چاہنے لگا ہے۔" مانیہ فوراً "فریج" کی طرف لپکی۔

"اور میں ٹھنڈی ٹھار لسی پینا چاہتا ہوں۔ ابھی خط میں لسی کا بھی ذکر آئے گا۔" ملت نے مہد کے ہاتھ سے جامن کا باؤل کھینچ کر ٹی وی ریموٹ سے آف کر دیا۔

"مجھے خط تو سن لینے دو۔ اپنی بک بک شروع کر دیتے ہو۔" اماں کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔

"ایسی ہی جھٹپٹے کی شام تھی۔" منہب نے خط پر نگاہیں جما دیں۔ وہ بمشکل ہنسی روکے خط پڑھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

"دو ادھر لا میں خود پڑھ لیتی ہوں۔ ملت! جا میری

نزدیک کی عینک اٹھالا۔" اماں بی سے ذرا سی تاخیر بھی برداشت نہیں ہوتی تھی اسی لیے منہب کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا۔ منہب شرافت سے خط پڑھنے لگا۔

"ایسی ہی اٹھٹیے کی شام تھی۔ تم اسی شام بچوں سمیت رہنے کے غرض سے آئی تھیں۔ میری گود میں صحت مند سی چندا کو دیکھ کر تمہیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں نے تمہیں بتایا کہ چندا میری دیورانی کی بیٹی ہے جسے ہم نے گود لے لیا ہے۔ تم نے چندا کو خوب پیار کیا۔ تمہاری اماں مرحومہ بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔ اور موتی چور کے لڈو بنانے کے لیے چنے کی دال صاف کررہی تھیں۔ مہد قریب چٹائی پر بیٹھا پڑھ رہا تھا اور تمہاری گوری چٹی بھتیجی نازنین بھی مہد کے ساتھ بیٹھی شاید ہوم ورک کررہی تھی۔ اس وقت مہد شاید ساتویں جماعت میں تھا یا آٹھویں میں۔

چندا تمہاری گود میں کھیل رہی تھی۔ تبھی تم نے اچانک کہا۔

"افسر! چندا میری بیٹی ہے اسے میں اپنے مہد کی دلہن بناؤں گی۔ مانو خوشی سے رات بھر مجھے نیند نہ آئی۔ ہم تو سیدھے سادے دیہاتی لوگ ہیں۔ زبان سے نکلی بات کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ میں نے اسی رات چندا کے ابا کو بتادیا تھا کہ پوری برادری والوں کو اطلاع دے دو کہ میری چندا افسر کے مہد کی ٹھیکرے کی مانگ ہے۔"

"ٹھیکرے کی مانگ...." منہب سمیت سب ہی کی سانسیں لمحہ بھر کو تھم سی گئیں۔ اماں بی کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیل گئے تھے اور اک نامعلوم اضطراب ان کی آنکھوں میں ہلکورے لینے لگا تھا۔

"آگے کیا لکھا ہے افسر نے۔" اماں بی نے قدرے دبی آواز میں پوچھا۔ منہب اس دھچکے سے ذرا سنبھل کر پھر سے خط کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

"پیاری قمر! میں تمہیں وعدہ یاد دلا رہی ہوں۔ ابھی مجھے کویت چلے جانا ہے۔ میشد میری چندا اب بالکل تنہا ہے۔ اس کی ماں دو ہفتے قبل وفات پاگئی ہے۔ باپ تو پیدائش سے دو مہینے پہلے ہی چل بسا تھا۔ تم اپنی امانت کو لے جاؤ۔ اسے میری التجا سمجھو یا درخواست میں تمام عمر تمہاری مشکور رہوں گی۔" خط اختتام پذیر ہوا تھا اور منہب کی زبان بغیر کوما' فل اسٹاپ کے چل پڑی۔

"خبردار' خبردار۔ اگر آپ نے چاچو کے ٹھیکرے کی مانگ کو یہاں لانے کی کوشش کی۔ دریا کے اس پار سے کسی گنوار جاہل کو لانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جو باشعور' تعلیم یافتہ اور زمانہ ساز خواتین ہیں انہیں بزرگوں بچوں کے حقوق کا نہیں پتا۔ ہمارے ساتھ اینٹ' پتھر کا بیر باندھا ہوا ہے۔ ذرا ہماری غلطی ان کی نازک طبیعتوں پر گراں گزرتی ہے۔ اب ایک جاہل خاتون کو لے آئیے گا تاکہ دوسرے — ہی دن وہ ہمیں نکال باہر کریں اور اپنی زبان کے اسے ایسے جوہر دکھائیں گی کہ ہمیں کہیں بھی منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملے گی۔ اور چلو بھر پانی میں ہمیں ہی ڈوب مرنا پڑے گا۔" منہب کا واویلا بجورت آنے تک جاری رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں میشد کے خلاف ڈھیروں عناد بھرے یہاں آیا تھا۔ واپسی کے سفر میں بھی وہ جلی کٹی سناتا رہا تھا۔ میشد حیران تھی۔ وہ بار بار اس ایسی سالہ لڑکے کو دیکھ رہی تھی جو نہ جانے کیوں اس سے خفا خفا سا تھا۔ مانیہ نے ولیمے کے دوسرے دن اس کے سوال پر ہنستے ہوئے کہا۔

"منہب آپ کو مند کی کمی محسوس نہیں ہونے دے گا چچی۔"

اور میشد کو کچھ دن گزرنے کے بعد مانیہ کی بات کی صداقت پر گویا یقین آگیا۔

میشد کو اپنانے کا فیصلہ بہت اچانک نہیں تھا بلکہ مہد نے بہت سوچنے کے بعد اماں بی کو رضامندی دی تھی۔ اس سے بھی پہلے اس نے نازنین کو فون کرکے پوری صورتحال سے آگاہ کیا۔ اول تو نین کروہ گم صم رہ گئی تھی۔ اوائل عمری کا خواب کل مقام پر ٹوٹ گیا

digest library.com

تھا۔اس کے آنسو ایک تواتر سے گرنے لگے۔

وہ اسے سمجھاتا رہا تھا بہت ساری باتیں بتاتا رہا۔وہ اپنی ماں کی آس کو نہیں توڑنا چاہتا تھا۔بہت دیر بعد ہی سہی نازنین اس کی تمام باتیں سمجھ کر اپنی محبت سے دستبردار ہو گئی تھی۔

"تم میرے نصیب میں نہیں تھے۔یہ سب تقدیر کے فیصلے ہیں۔اور تقدیر سے کیا لڑنا۔تم پھوپھو کے مان کو مت توڑنا۔وہ پہلے ہی تمہارے بڑے بھائیوں کے رویوں اور ان کی خود غرضانہ سوچ کی وجہ سے دلبرداشتہ ہیں۔ماں کی دعا تو پوری زندگی کا حاصل ہوتی ہے۔تم اپنی ماں کی ساری دعائیں سمیٹ لو۔"

"تھینک یو نینو! تم نے میری آدھی ٹینشن ختم کر دی ہے۔اگرچہ ہمارے درمیان بظاہر کچھ بھی نہیں تھا تاہم میں خود کو تمہارا مجرم سمجھ رہا تھا۔یہ مت سمجھنا کہ اب تم لوگ میری ذمہ داری نہیں رہے ہو۔جب تک زوہیب اپنی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا تب تک تم اور مامی میرے ساتھ رہو گے۔اور میں اپنے فرائض کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔تم زوہیب کے لیے فکر مند مت ہونا۔"ایسی بہت ساری تسلیاں دے کر اس نے فون رکھ دیا تھا اس کا ضمیر مطمئن تھا وہ کسی کا دل دکھانے کا سبب نہیں بنا تھا مگر اس کے باوجود بہت ساری آزمائشیں مہد یار کے حصے میں چلی آئی تھیں۔

وہ اور نازنین اچھے دوست تھے اور ان دونوں نے ہمیشہ اچھے دوست رہنے کا وعدہ کیا تھا اماں بی کو گھر کے اخراجات کے علاوہ وہ مامی کو اپنی تنخواہ میں سے مخصوص رقم تھما دیتا تھا۔وہ پہلے بھی مہد سے خوش تھیں۔اب بھی مطمئن تھیں ولیمہ میں مامی اور نازنین دونوں نے شرکت کی تھی۔ملہ کو مہد کی یہ کزن بہت پسند آئی تھی۔باوقار اور سنجیدہ سی۔

مہد ولیمہ کے چوتھے روز کراچی چلا گیا تھا۔اور ملہ نے خود کو روٹین لائف میں مصروف کر لیا۔

سب سے پہلے تو اس نے اپنے پورشن کی از سر نو صفائی کی۔چھتیں، دیواریں تک جھاڑیں پردے دھوئے۔اگرچہ کئی سالوں کی دھول مٹی سے لئے کافی بوسیدہ ہو گئے تھے تاہم اچھی طرح دھونے سے کافی بہتر لگنے لگے۔چوچک دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی رہی۔اور ملہ اس کے چہرے کے بگڑے بگڑے تاثرات سے مزا لیتی رہی۔

اندرونی حصہ صاف کرنے کے بعد اب ملہ کی توجہ بیرونی صحن کی طرف خود بہ خود مبذول ہو گئی لان کے لیے تو کوئی جگہ نہیں تھی کہ کچھ نئے پودے لگا لیے جاتے۔پورے صحن میں ماربل لگا ہوا تھا۔البتہ گملوں کی بہتات تھی اور ان میں بے جان ہوتے سوکھے سڑے سے گرد آلود پودے۔جنہیں پانی دینے کا تو شاید گھر کے کسی فرد کو خیال نہیں آیا تھا۔سب سے بری حالت گیٹ کے قریب رکھے ڈرم کی تھی جو کہ پانچوں پورشنز کے کوڑے کرکٹ اور گندگی سے لبالب بھرا ہوتا تھا۔ہر ہفتے کوڑا اٹھانے والی چمپا آتی تھی۔اس نے بڑی مشکل سے اسے روزانہ آنے کے لیے رضامند کیا۔اس کی تنخواہ میں دو سو روپے کا مزید اضافہ کیا۔اب روزانہ ڈرم خالی ہو جاتا تھا۔اور گھر میں داخل ہوتے ہی اس ناگوار بو اور سڑاند سے نجات مل گئی تھی۔کچھ ہی دنوں بعد گملوں کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔سفید اور سرخ پینٹ سے خوشنما لگنے لگے تھے اور ان میں موجود نوحہ کناں پودوں نے بھی پھلنا پھولنا شروع کر دیا تھا اس تبدیلی کو سب نے ہی محسوس کیا تھا البتہ سب سے پہلے اظہار سونیا بھابھی نے کیا۔وہ مہینے میں ایک دو مرتبہ سائیں صاحبہ کی قدم بوسی کے لیے تشریف لے ہی آتی تھیں۔اندرونی حصے کی طرف دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔

"واؤ ملہ! تم نے تو کمال کر دیا ہے۔"ان کے تعریفی جملے پر وہ صرف مسکرا کر رہ گئی حالانکہ سامان تو پرانا تھا۔بس ترتیب، صفائی اور نفاست کی وجہ سے سب ہی ٹھٹک کر اک لمحے کو تو ضرور ہی رکتے تھے۔

کچن، لاؤنج، گول کمرہ اور سٹنگ روم سب صاف ستھرے بہت اچھا تاثر دے رہے تھے۔شاید اسی لیے نفاست پسند نک چڑھی سی سونیا بھابھی کا موڈ بے حد خوشگوار ہو گیا تھا۔

ملیحہ کچن میں چلی آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے چائے کے لیے چولہے پر پانی چڑھایا پھر فریج میں سے کھجور کا حلوہ نکال کر گرم کیا۔ ٹرالی میں برتن سیٹ کیے' نمکو' بسکٹس اور نگٹس پلیٹوں میں علیحدہ علیحدہ رکھے۔ پھر چٹنی بھرے شامی کباب فرائی کیے۔ چکن رول' میٹھے سموسے اور ناریل کی چٹنی کے ساتھ پرتکلف چائے تیار تھی۔ جوں ہی وہ ٹرالی گھسیٹ کر کمرے میں آئی سونیا بھابھی فوراً" بولیں۔

"ملیحہ! چائے آج صحن میں پیتے ہیں۔"

"لائیے چاچی! میں ٹرالی صحن میں لے جاتا ہوں۔" فہیم فوراً" اس کی مدد کے خیال سے بھاگا چلا آیا تھا۔

وہ صحن میں بیٹھے دلفریب موسم کی رنگینی کو محسوس کرتے ہوئے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب منہب کتابیں اٹھائے گیٹ سے اندر چلا آیا۔

"چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔" وہ طنز کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔

"ہر اندھیری رات کی ایک سحر بھی ہوتی ہے۔" ملیحہ نے بغیر برا منائے اطمینان سے کہا۔

"ملیحہ! تم نے مجھے انناس کی پڈنگ کی ریسپی بتانی ہے۔" سونیا بھابھی میٹھے سموسوں اور ناریل کی چٹنی سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے بولیں۔ اماں بی بھی تمام پرہیز بالائے طاق رکھے چکن رول چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھیں۔

"اماں! آپ کے لیے صرف کھجور کا حلوہ ہے۔" ملیحہ ان کی بدپرہیزی دیکھ کر چیخ اٹھی۔

"فہد بہت غصہ کریں گے۔ رات کو انہوں نے فون کر کے آپ کے کھانے پینے کی تفصیل پوچھنی ہے۔ اور آپ کو پتا ہے میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"آج بول دیجیے گا۔ چاچو کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے۔" مانیہ نے اسے تسلی دی۔ اسی طرح کی خوشگوار باتوں میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ سونیا بھابھی اٹھنے لگیں تو ملیحہ فوراً" بولی۔

"کھانا کھا کر جائیے گا بھابھی!"

"ارے نہیں' اب اتنا کچھ تو ٹھونس چکی ہوں۔ رات کو بالکل نہیں کھاؤں گی۔ اور ابھی بچوں کی وجہ سے جا رہی ہوں۔ ان کے قاری صاحب کے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔" سونیا بھابھی نے حلاوت سے جواب دیا۔

"بچوں کو بھی لے آتیں ہر دفعہ انہیں گھر چھوڑ آتی ہیں۔" وہ بڑی بھابھی کے فہد کو گود میں بٹھائے حلوہ کھلاتے ہوئے قدرے خفگی سے بولی۔

"نیکسٹ سنڈے کو لے کر آؤں گی بلکہ موسیٰ بھی آئیں گے۔ کہہ رہے تھے ملیحہ سے اچھی حلیم کوئی پکا ہی نہیں سکتا۔" سونیا مسکراتے ہوئے اپنی آٹو کی طرف بڑھ گئیں۔ ملیحہ نے مانیہ کو سامان سمیٹنے کے لیے کہا تھا اور خود فہد کا منہ دھونے لگی۔ جوں ہی وہ صحن کی طرف گئی محسن کو گملے میں سے تازہ نم مٹی سے کھیلتے ہوئے دیکھ کر فوراً" لپک کر آئی اس نے منہ' ہاتھ اور کپڑوں کو خوب رنگین کر لیا تھا۔ ابھی ابھی تو وہ اوپر سے نہا کر آیا تھا اب یقیناً" اسے نائلہ بھابھی سے مار پڑنی تھی سو وہ خود ہی اسے اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ پہلے اسے نہلایا پھر کپڑے تھوڑے سے سرف میں ڈال کر بھگو دیے' مانیہ' محسن کے اوپر سے کپڑے لے آئی تھی۔ ملیحہ نے اسے کپڑے پہنا کر بال بنائے اور پھر کافی رعب داب سے ڈانٹا۔

"اب گملے میں ہاتھ ڈالو گے؟"

"نہیں' چاچی۔" اس نے اپنا ہاتھ محسن کے سامنے پھیلا دیا۔

"پکا والا پرامس۔" محسن ہنستے ہوئے اس سے لپٹ گیا تھا۔ ملیحہ نے اس کے سرخ سرخ گالوں کو بے ساختہ چوم لیا۔

☼ ☼ ☼

"میرے کپڑے کہاں رکھے ہیں۔" منہب نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ملیحہ نے اماں بی کی قمیص سلائی کرتے ہوئے سر اٹھا کر چلاتے ہوئے منہب کی طرف دیکھا اور تحمل سے بولی۔

"کیا ہوا ہے؟"

"میرے کپڑے، رومال اور جرابیں نہ جانے مانیہ نے کہاں ٹھونس دیے ہیں۔" منہب یوں ہی پہلے دن سے ملشہ کے لیے کوئی نہ کوئی پرابلم کری ایٹ کر دیتا تھا۔ کبھی کھانے میں نقص تو کبھی مانیہ کے ساتھ لڑائی جھگڑا۔ وہ اپنا اشتعال کسی نہ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر نکال ہی دیتا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ملت، نیم کے مشترکہ کمرے میں لے آئی۔ ان تینوں کے پلنگ اسی کمرے میں ترتیب سے سیٹ تھے۔ ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل تھی جس کے گرد تین کرسیاں موجود تھیں۔ ملشہ دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ کپڑے مانیہ نے نہیں بلکہ میں نے الماری میں ترتیب سے پریس کر کے رکھے ہیں۔ اس دراز میں تم تینوں کے سوکس، رومال اور یونیفارم کی ٹائیاں ہیں۔"

"سوری چاچی!" وہ ایک دم پشیمان ہو گیا۔

"اِٹس او کے۔" ملشہ مسکرا کر باہر نکل گئی تھی اور منہب حیران حیران سا اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا۔ پہلی دفعہ جب اس نے ملشہ کو دیکھا تو کچے مکان میں کھڑی اول جلول سے حلیے والی ملشہ اسے قطعاً" پسند نہیں آئی تھی مگر ملشہ چاچی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو پہلی نظر میں نہیں بلکہ دھیرے دھیرے اپنا تاثر چھوڑتے ہیں اور یہ تاثر بہت اپنا اپنا بہت گہرا اور دل میں اترنے کا باعث بنتا ہے۔ کچھ ایسی بات مہد چاچو رات کو فون پر کہہ رہے تھے۔

"کیوں پیارے! میری بیوی کے مائنس مارکس میں سے کچھ پلس کا اضافہ ہوا ہے یا نہیں۔" وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

"چاچی اچھی ہیں۔" اس نے کچھ جھینپتے ہوئے اعتراف کر لیا۔

"او۔ ہو! دو مہینے گزر جانے کے بعد تمہیں احساس ہو ہی گیا ہے حالانکہ ہم تو پہلی نظر میں ان کی اچھائیوں "اور خوبیوں" کو جان چکے تھے۔" مہد کا انداز بہت بھرپور ستائشی اور دل موہ لینے والا تھا۔

"منہ دھو رکھیے۔ دادی کے حصے میں تمام کریڈٹ جاتا ہے۔ ملشہ چاچی خالصتاً" ان کی پسند سے آئی ہیں۔" منہب نے اسے خوب "جتا" کر کہا۔ دروازے میں کھڑی ملشہ مطمئن سی ہو کر پلٹ گئی تھی۔ اس کے دل پر رکھا ایک نوکیلا پتھر ہٹ چکا تھا۔ وہ منہب اور منہب کے چاچا کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اور اسے یقین تھا کہ محبت، خلوص، پیار اور ایثار سے وہ سب کے دلوں کو جیت لے گی۔

مہد مہینے میں دو یا تین چکر لگا لیتا تھا۔ اور بچے اس کا خوب خوب ریکارڈ لگاتے تھے۔

"تم نے اس مقولے پر خوب غور و فکر کیا ہے ملشہ۔" رات کو مہد اسے مساج کرتا دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"کون سے مقولے پر۔" وہ حیران ہوئی۔

"یہی معدے کے راستے دل میں اترنے والے مقولے پر۔" مہد نے ہنسی دبائی۔ "منہاج بھائی تمہاری تعریف کر رہے تھے۔"

"تائی جی نے مجھے کوکنگ میں اچھا خاصا ایکسپرٹ کر دیا تھا مگر میں نے کوکنگ بیکنگ کا کورس بھی کر رکھا ہے۔" وہ روانی سے بولتے ہوئے قدرے لب بھینچے خاموش ہو گئی۔

"کورس۔" مہد کی آنکھوں میں حیرانی در آئی "تم نے باقاعدہ کلاسز لی ہیں۔"

"ہوں۔" اس نے محض ہنکارا بھرا۔

"کیا ایجوکیشن ہے تمہاری؟" مہد نے لہجے کو خوب سرسری بنا کر پوچھا۔

"میں نے ایم کام کیا ہے۔"

"واٹ؟" مہد اچھل ہی تو پڑا تھا۔ "کہاں سے پڑھا ہے؟" وہ کچھ مشکوک ہوا۔

"کالج آف کامرس سے۔" ملشہ نے لاپروائی سے بتایا مگر مہد کو چونکتا دیکھ کر وہ ہنسنے لگی تھی پھر اس کی کیفیت کا مزا لیتے ہوئے بولی "آپ کے خیال میں تو میں بالکل گنوار اور جاہل تھی۔" مہد کے چہرے پر اترتی خفت کی سرخی کو دیکھ کر وہ جی بھر کر لطف اندوز

"کیا ہوا ہے؟"

"میرے کپڑے، رومال اور جرابیں نہ جانے مانیہ نے کہاں ٹھونس دیئے ہیں۔" منہب یوں ہی پہلے دن سے ملشہ کے لیے کوئی نہ کوئی پرابلم کری ایٹ کر دیتا تھا کبھی کھانے میں نقص تو کبھی مانیہ کے ساتھ لڑائی جھگڑا۔ وہ اپنا اشتعال کسی نہ کسی بات کو بڑھا چڑھا کر نکال ہی دیتا تھا۔

digest library.com

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر منت، نعیم کے مشترکہ کمرے میں لے آئی۔ ان تینوں کے پلنگ اسی کمرے میں ترتیب سے سیٹ تھے۔ ایک کونے میں رائٹنگ ٹیبل تھی جس کے گرد تین کرسیاں موجود تھیں۔ ملشہ دیوار گیر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

"یہ کپڑے مانیہ نے نہیں بلکہ میں نے الماری میں ترتیب سے پریس کر کے رکھے ہیں۔ اس دراز میں تم تینوں کے سوکس، رومال اور یونیفارم کی ٹائیاں ہیں۔"

"سوری چاچی!" وہ ایک دم پشیمان ہو گیا۔

"اٹس او کے۔" ملشہ مسکرا کر باہر نکل گئی تھی اور منہب حیران حیران سا اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا۔

پہلی دفعہ جب اس نے ملشہ کو دیکھا تو کچے مکان میں کھڑی اول جلول سے حلیے والی ملشہ اسے قطعاً پسند نہیں آئی تھی مگر ملشہ چاچی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جو پہلی نظر میں نہیں بلکہ دھیرے دھیرے اپنا تاثر چھوڑتے ہیں اور یہ تاثر بہت اپنا اپنا بہت گہرا اور دل میں اترنے کا باعث بنتا ہے۔ کچھ ایسی بات مہد چاچو رات کو فون پر کہہ رہے تھے۔

"کیوں پیارے! میری بیوی کے مائنس مارکس میں سے کچھ پلس کا اضافہ ہوا ہے یا نہیں۔" وہ شرارت سے پوچھ رہا تھا۔

"چاچی اچھی ہیں۔" اس نے کچھ جھینپتے ہوئے اعتراف کر لیا۔

"او۔ ہو! دو مہینے گزر جانے کے بعد تمہیں احساس ہوا ہی کیا ہے حالانکہ ہم تو پہلی نظر میں ان کی اچھائیوں "اور خوبیوں" کو جان چکے تھے۔" مہد کا انداز بہت بھرپور ستائشی اور دل موہ لینے والا تھا۔

"منہ دھو رکھیے۔ دادی کے حصے میں تمام کریڈٹ جاتا ہے۔ ملشہ چاچی خالصتاً" ان کی پسند سے آئی ہیں۔" منہب نے اسے خوب "جتا" کر کہا۔

دروازے میں کھڑی ملشہ مطمئن سی ہو کر پلٹ گئی تھی۔ اس کے دل پر رکھا ایک نوکیلا پتھر ہٹ چکا تھا۔ وہ منہب اور منہب کے چاچا کا دل جیتنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اسے یقین تھا کہ محبت، خلوص، پیار اور ایثار سے سب کے دلوں کو جیت لے گی۔

مہد مہینے میں دو یا تین چکر لگا لیتا تھا۔ اور بچے اس کا خوب خوب ریکارڈ لگاتے تھے۔

"تم نے اس مقولے پر خوب غور و فکر کیا ہے ملشہ۔" رات کو مہد اسے مساج کرتا دیکھ کر شرارت سے بولا۔

"کون سے مقولے پر۔" وہ حیران ہوئی۔

"یہی معدے کے راستے دل میں اترنے والے مقولے پر۔" مہد نے ہنسی دبائی۔ "منہاج بھائی تمہاری تعریف کر رہے تھے۔"

"تائی جی نے مجھے کوکنگ میں اچھا خاصا ایکسپرٹ کر دیا تھا مگر میں نے کوکنگ، بیکنگ کا کورس بھی کر رکھا ہے۔" وہ روانی سے بولتے ہوئے قدرے لب بھینچے خاموش ہو گئی۔

"کورس۔" مہد کی آنکھوں میں حیرانی در آئی "تم نے باقاعدہ کلاسز لی ہیں۔"

"ہوں۔" اس نے محض ہنکارا بھرا۔

"کیا ایجوکیشن ہے تمہاری؟" مہد نے لہجے کو خوب سرسری بنا کر پوچھا۔

"میں نے ایم کام کیا ہے۔"

"واٹ؟" مہد اچھل ہی تو پڑا تھا۔ "کہاں سے پڑھا ہے؟" وہ کچھ مشکوک ہوا۔

"کالج آف کامرس سے۔" ملشہ نے لاپروائی سے بتایا مگر مہد کو چونکتا دیکھ کر وہ ہنسنے لگی تھی پھر اس کی کیفیت کا مزا لیتے ہوئے بولی "آپ کے خیال میں تو میں بالکل گنوار اور جاہل تھی۔" مہد کے چہرے پر اترتی خفت کی سرخی کو دیکھ کر وہ جی بھر کر لطف اندوز

ہوئی۔

"کیا واقعی میں شکل سے اتنی گنوار لگتی ہوں کہ یہ ایم کام کی اعزازی ڈگری بھی گنوار پن کی چھاپ نہیں اتار سکی۔" ملیحہ حد درجہ معصومیت سے بولتی ہوئی سیدھا مہد کے دل میں اتر گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تھا پھر ملیحہ کے قریب جا پہنچا۔

"میں نے تو اس وقت قبول ہے' قبول ہے' قبول ہے کہا تھا جب مجھے صرف اتنا علم تھا کہ تم واقعی گنوار' جاہل اور پینڈو ہو مگر اب۔" وہ شدت جذبات سے غلط ملط بولتا اسے بانہوں میں بھینچ بھینچ کر گول گول گھماتا چیخ رہا تھا تبھی تو اماں بی اس کے شور اور چلانے کی آواز سن کر دہلتی ہوئی دھاڑ سے دروازہ کھولے گرتی پڑتی اندر چلی آئیں۔ ان کے پیچھے مانیہ' نیم اور ملت بھی گھبرایا' بوکھلایا دوڑا دوڑا چلا آیا۔ ملیحہ نے اس کے بانہوں کے حلقے کو توڑا اور خفت زدہ سی اماں کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا ہوا ہے؟" اماں بی گھبرائی گھبرائی ملیحہ کو ساتھ لگاتے ہوئے بولیں۔

"کچھ نہیں اماں! ملیحہ نے چھپکلی دیکھ لی تھی۔" مہد بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے لاپروائی سے کہنے لگا۔

"مگر آواز تو تمہاری تھی۔" اماں کو اس کے جھوٹ پر قطعاً یقین نہیں آیا۔

"اوہ اچھا اچھا۔" وہ گڑبڑا سا گیا۔ "میرے گلے میں خراش ہونے لگی تھی۔ اسی لیے میں۔"

"حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے تھے۔" اماں نے اس کے ادھورے جھوٹ کو مکمل کیا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنستا رہا۔

"چاچی! بھلا دیواروں سے چپکی اس مخلوق سے کیسا خوف۔" نیم نے حیرانی سے کہا۔

"میں نہیں ڈرتی ورتی کسی سے جاؤ تم لوگ کتابیں لے کر آؤ۔ پھر میں نے کھانا بھی بنانا ہے۔ قاسم' عمر اور مرسلین کو بھی بلاؤ۔" ملیحہ نے نائلہ اور نادیہ کے بچوں کا نام لیا۔ بسمہ کا بیٹا بہت چھوٹا تھا۔ مگر دوسرے بچوں کو کتابیں کھولے پڑھتے دیکھ کر خود بھی کتاب لے کر بیٹھ جاتا۔ کاشان کے شوق کو دیکھ کر وہ اس پر بھرپور توجہ دینے لگی تھی۔ جہاں بچوں کو ملیحہ کے پاس مگن اور شوق سے پڑھتا دیکھ کر بچوں کی مائیں مطمئن ہوئی تھیں وہیں ان کی اپنی کہی باتیں ان کا منہ چڑاتی رہیں۔ وہ جو ملیحہ کی معمولی شکل اور کم تعلیم کو موضوع گفتگو بنا کر اسے ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کرتی رہی تھیں اب خفت اور شرمندگی سے منہ چھپاتی پھرتی تھیں جب بچوں نے ملیحہ کی تعلیم اور ذہانت کی جی بھر کر تعریفیں کیں۔ ملیحہ بچوں کو بھرپور توجہ سے پڑھاتی تھی۔ بھابھیوں کے ٹیوٹرز کے اخراجات خود بہ خود ختم ہو گئے تھے اور وہ ملیحہ کی اچھی خاصی احسان مند ہو چکی تھیں۔

ادھر اب انہیں کھانے پینے کی بھی کوئی پرابلم نہیں تھی۔ تینوں وقت کا کھانا' ناشتا نیچے ہی دیگ نما دیگچے میں پکتا تھا اور وہ ڈیوٹیاں بھگتا کر فریش ہونے کے بعد آرام سے ڈونگے بھرتیں اور ہاٹ پاٹ سے روٹیاں نکالتیں اور اطمینان سے اپنے اپنے پورشن میں اے سی لگا کر خوب سیر ہو کر کھاتیں۔ ساتھ اماں بی کے انتخاب کو سراہتی بھی ضرور تھیں۔

بہت کم عرصے میں وہ سب کی پسندیدہ اور ہر دلعزیز ہستی بن چکی تھی۔ اماں بی کے سامنے جب کوئی ان کی سب سے چھوٹی بہو کی تعریف کرتا تو اماں بی کا سر فخر سے تن جاتا۔ اک عجیب سا غرور ان کے لہجے میں جھلکنے لگتا۔

"بڑی بہو ساس مرحومہ کی پسند تھیں اور چھوٹی دونوں کے والد محترم کی۔ جبکہ دو بیٹوں نے پسند ناپسند کی زحمت سے بچا لیا تھا البتہ ملیحہ صرف اور صرف میری پسند سے آئی ہے۔ میرا انتخاب لاجواب ہے ہیرے کی کنی کو تلاش کیا ہے میں نے۔" وہ تفخر سے کہتیں۔

ملیحہ کی مصروفیت کا گراف دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بھی قسم کی ستائش اور تعریف کی توقع اور طلب کے بغیر خلوص نیت سے سب کا خیال اور

احساس کرتی تھی۔ تائی جی کے ہفتے میں دو تین فون اور خط وغیرہ آجاتے تھے۔ وہ اسے بہت سمجھاتی بجھاتی رہتی تھیں۔ زمانے کی اونچ نیچ سسرالیوں کے رویے۔

"بس دلوں پر گرد نہیں آنی چاہیے۔ چھوٹی موٹی رنجشوں پر دل چھوٹا نہیں کرتے۔" شروع شروع میں وہ بڑی بھابیوں کی تلخ کلامی اور طنزیہ گفتگو سن کر گھبرا جایا کرتی تھی مگر کچھ ہی عرصہ بعد اس کی محبت، نسیت اور خلوص نے انہیں ملیحہ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

"اپنا مرد توجہ اور محبت دے تو پھر مشکل کیسی۔ بھرے پرے گھروں میں سو باتیں ہو جاتی ہیں۔ اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کیا کرو۔ اور دیکھو بیٹی! جٹھانیوں کے سامنے اپنا "بھرم" توڑنے کی کوشش کبھی نہ کرنا اس "بھرم" کی آڑ میں عورت بہت محفوظ اور معتبر ہوتی ہے۔" تائی جی کی ہر بات اس نے گویا گرہ سے باندھ لی تھی۔

مہد کراچی سے آتا تب وہ قدرے تاخیر سے اٹھتی تھی کہ صبح صبح مہد کو کھٹر پٹر سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ نیند کا بڑا رسیا تھا سوا اپنی نیند کا اسے خاص خیال رہتا تھا۔ جبکہ ملیحہ کی صبح کا آغاز منہ اندھیرے ہو جاتا تھا۔ نماز کے بعد معمول کی تلاوت اور پھر یہ ختم ہونے والے کاموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ناشتے کے بعد تقریباً" دس بجے تک تمام مرد حضرات، خواتین اپنے اپنے دفتروں اور بچے اسکول، کالجوں کے لیے نکل جاتے تھے۔ ملیحہ اپنی زیر نگرانی پورے گھر کی صفائی کرواتی تھی۔ اس کے بعد کبھی نائلہ اور کبھی نادیہ بھابھی کے کپڑے سلائی ہو رہے ہیں۔ کبھی بچوں کے کرتوں پر کڑھائی کی جا رہی ہے۔ کبھی مانیہ کے لیے غرارہ، شرارہ تیار کیا جا رہا ہے۔

بسمہ اس کی سلائی میں نفاست اور ڈیزائنگ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کی خواہش تھی ملیحہ اس کے بوتیک کے لیے اچھے اچھے ڈیزائن تیار کر دے۔ ان دنوں وہ بسمہ کی فرمائش بڑی تندہی سے پوری کرنے کے چکروں میں تھی۔ کبھی نادیہ بھابھی بیمار ہوتیں تو ملیحہ ان کے ڈھیروں کے حساب سے کپڑے مشین لگا کر دھو دیتی۔ نائلہ کی زچگی کے دنوں میں بچے اور گھر کی دیکھ بھال بڑی جانفشانی سے کرتی۔

ان دنوں مسکان بھی ڈلیوری کی غرض سے میکے گئی ہوئی تھی۔ روزانہ فون کر کے وہ ملیحہ کو ہدایات دیتی تھی کہ اس کے پورشن کی ڈسٹنگ لازمی کروا دی جائے کیونکہ اسے ڈسٹ الرجی تھی۔ واپس آنے کے بعد وہ گھر کو صاف ستھرا دیکھنا چاہتی تھی۔

آج کل ملیحہ اماں بی سے نئے پردوں، نور کشن اور صوفے وغیرہ کے نئے کورز کی فرمائش کر رہی تھی۔ اماں بی اس اضافی خرچ کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اسی لیے اس نے مہد سے فرمائش کی۔

"کمال ہے بیوی یار! میں سمجھ رہا تھا۔ تم رانی، نیلم یا توت کے ہار کی فرمائش کرو گی اتنے عرصے بعد مانگا بھی تو کیا۔ پردے، کورز اور الم غلم۔" مہد نے مصنوعی تاسف سے ہنکارا بھرا۔

"مجھے ان فضولیات سے دلچسپی نہیں۔" ملیحہ نے ناک چڑھائی۔

"ذرا میری بھابھیوں کی کمپنی میں بیٹھنا۔ وہ تمہیں اس صدی کی مخلوق نہیں سمجھیں گی۔"

"وہ مجھے کیا سمجھتی ہیں۔ میں نے کبھی پروا نہیں کی۔" اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ "آپ کے حوالے سے وہ میرے لیے قابل احترام ہیں۔"

"زیادہ سر چڑھانے کی ضرورت نہیں۔" مہد نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اچھا اب اٹھ بھی جائیے۔ سونیا بھابھی کی طرف دعوت ہے۔ سب تیار ہو چکے ہیں، بس آپ بیٹھ کر باتیں بگھارتے رہیں۔" ملیحہ اس کے کپڑے نکالتے ہوئے زیر لب بڑبڑاتی رہی۔

"ہر شریف شوہر کی ایک عدد اضافی خوبی بھی ہوتی ہے۔" واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے مہد نے بڑے ہی مدبرانہ انداز میں کہا۔

"کون سی خوبی۔" ملیحہ چونکی۔

"میری طرح فرماں بردار، تابعدار۔" وہ ہنستے ہوئے واش روم میں گھس گیا تھا جبکہ ملیحہ بھی سر جھٹک کر

مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

نئے پردے' کورز کے ساتھ ساتھ دو نئے کور صوفہ سیٹ بھی آگئے تھے اور بیڈ روم سیٹ بھی مہد نے اسے سالگرہ کے گفٹ کے طور پر دیا تھا۔

ان کی شادی کو ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ مسکان' پیاری سی بیٹی کی ماں بن چکی تھی ان کی شادی ملشہ کے نکاح سے ہفتہ بھر پہلے ہوئی تھی اور اس وقت مسکان کی گود میں ننھی کومل موجود تھی۔ پہلی مرتبہ عجیب سی بے کلی اور خالی پن نے ملشہ کو نامعلوم اضطراب کے سمندر میں دھکیل دیا تھا مگر یہ بے چینی وقتی تھی کچھ دیر بعد وہ مہمانوں کی آمد کی وجہ سے مصروف ہوتی چلی گئی تھی۔ دوست' احباب سب مبارک باد دینے آرہے تھے۔ مہد بھی شام کو پہنچ چکا تھا۔ وہ بچی کے لیے بہت سے گفٹ لایا تھا۔ فراک' کھلونے اور ننھے منے سے سینڈل۔ ایک دفعہ پھر ویسے ہی اضطراب اور اندر کے خالی پن نے اسے بے چین کر دیا۔

"نہ جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔" اس نے رنجیدگی سے سوچا تھا اور بچی کے چہرے پر جھکے مہد کی طرف دیکھتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ "تو کیا سامنے موجود بچی کی وجہ سے میں اس قدر مضطرب ہوں۔ اور یہ دل میں بپا شور اور اس شور کے بھیانک سناٹے۔ میرے اندر کی پیاسی ممتا ان بچوں پر ڈھیروں پیار لٹانے باوجود کیوں بے قرار ہے۔" وہ کھڑے کھڑے کیا سن ہو چکی تھی۔ تبھی مہد کی آواز سنائی دی۔

"ملشہ! ایک جگ پانی کا لے کر آؤ۔"

"پانی۔" جوں ہی وہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر اندر آئی مہد کو اس سے نئی وی میں گم دیکھ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

"کہاں جا رہی ہو۔؟" اس کے ہاتھ سے گلاس اور جگ پکڑ کر مہد نے ملشہ کو پلٹتے دیکھ کر پوچھا۔

"ابھی آتی ہوں۔" وہ بھرائی سی نم نم آواز میں بولی۔

"واپس آؤ۔"

"تھوڑی دیر تک آتی ہوں۔ ابھی کچن میں کام ہے۔" وہ نگاہ چرا کر باہر کی طرف بڑھنے لگی تھی جب مہد نے تحکم بھرے لہجے میں اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"یہاں آؤ' میرے پاس بیٹھو۔" مہد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھا کر نرمی سے کہا۔

"کیا پرابلم ہے؟ تھک چکی ہو؟ اتنے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خوا مخواہ خود کو تھکاتی ہو۔"

"میں خود کو تھکاتی نہیں بلکہ فضول سوچوں سے نجات کی غرض سے خود کو مصروف رکھتی ہوں۔" ملشہ خود کو سنبھال چکی تھی تبھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"کیسی فضول سوچیں۔" مہد نے ٹھٹک کر اس کے چہرے پر نگاہ جمائی۔

"کچھ نہیں۔" اس کا انداز صاف ٹالنے والا تھا۔

"ملشہ! کیا پریشانی ہے۔ شیئر کرلو۔" اس نے بہت نرمی اور محبت سے اس کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر یقین بھرے لہجے میں کہا تو ملشہ ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مہد گھبرا گیا تھا۔

"ملشہ! پلیز کچھ بتاؤ تو سہی' ورنہ میں اماں کو آواز دینے لگا ہوں۔"

"کیا بتاؤں۔؟" اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبریز تھیں۔

"کیوں روتی ہو۔؟ کیا وجہ ہے۔"

"مہد! مہد' مجھے بھی ایک بچہ چاہیے۔ جو صرف میرا ہو۔ میرا اپنا۔ جسے میں جی بھر کر پیار کروں جو مجھے کبھی چھوڑ کر نہ بھاگے۔" وہ گالوں پر پھسلتے آنسو پونچھ کر بولی۔

"ارے۔ ارے' اتنی سی بات کے لیے آنسو بہا رہی ہو۔" مہد نے اک طویل سانس کھینچا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔ ہماری شادی کو ایک سال ہو چکا ہے۔"

"صرف ایک سال ہوا ہے ایک سو سال نہیں۔" وہ غیر سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کو تو احساس ہی نہیں۔"

"تمہاری طرح رونا شروع کردوں۔" مہد نے ہنستے ہنستے اس کے گال پر چپت لگائی۔

"پلیز مہد!" وہ روہانسی ہوگئی۔

"کیا چاہتی ہو تم۔" مہد ایکدم سنجیدہ ہوگیا۔

"اگر چیک اپ کروانا ہے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ میں کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرلوں گا۔ تم بس یہ چہرے کے ڈیزائن ٹھیک کرلو۔ میں کراچی سے ہر تیسرے چوتھے دن یہ بے رنگ پرنٹ دیکھنے کے لیے نہیں دوڑا دوڑا چلا آتا۔"

"آپ بھی نا۔" ملشہ روتے روتے مسکرانے لگی تھی۔ پھر اچانک خیال آنے پر مہد کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"نازنین کی کہیں بات چیت طے ہوئی۔"

"یہ خالص زنانہ قسم کی گفتگو میرے ساتھ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"آپ کو پتا تو ہوگا۔" ملشہ مشکوک ہوئی۔ "سارے "زنانہ" مشورے آپ سے ہی تو کرتی ہیں۔"

"منیبہ کی پسند کافی اونچی ہے۔"

"کتنے فٹ اونچی۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"چھ فٹ گیارہ انچ۔" اس کا اشارہ مہد کی طرف تھا۔

"بکو نہیں۔" وہ سمجھ کر مصنوعی خفگی سے بولا۔

"معاملہ تو کچھ یہی لگتا ہے۔" اس نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔

"بات تو سچ ہے مگر۔" مہد بھی جان بوجھ کر اسے ستانے چڑانے لگا تھا۔

"مگر کیا؟" وہ بے چین ہوئی۔

"تم بیچ میں ٹپک پڑی تھیں۔"

"اگر میں نہ ہوتی تو۔" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"تم کیسے نہ ہوتیں جانم! ہمارا تمہارا نام تو آسمانوں پر لکھا جا چکا تھا۔" مہد مخمور نظروں سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

"نازنین کا فون آیا تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھی۔؟"

"آپ کی واپسی کا پوچھ رہی تھی۔"

"کیوں؟"

"یہ تو آپ کو پتا ہونا چاہیے۔"

"تم پوچھ لیتیں؟" مہد اسے باہر نکلتا دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "کہاں جارہی ہو؟"

"کام ہے مجھے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔

"بھاڑ میں گئے سارے کام۔ میرے رومینٹک موڈ کا ستیاناس کردیتی ہو۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ مصنوعی معصومیت سے بولی۔

"ستم ڈھا کے پوچھتے ہو۔ کہاں کہاں چوٹ لگی ہے۔" مہد نے آہ بھری۔

"اتنی آہیں نہ بھریں، میں تکور کا سامان لے آتی ہوں۔" وہ جھپاک سے دروازہ کھولے باہر نکل آئی۔ لاؤنج میں گتھم گتھا منیبہ اور ملت کو دیکھ کر اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"کیا بے ہودگی ہے یہ؟" اس نے لہجے میں کمال کا دبدبہ اور رعب سمو کر بلند آواز میں کہا تھا۔ منیبہ اور ملت دونوں ایک دم سنبھل کر اٹھے اور ہاتھ جھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ "کہاں ہے بے ہودگی۔" منیبہ صوفے اور پردے کے پیچھے سے کسی نادیدہ چیز کو تلاشنے لگا تھا۔

"میں نے سمجھا یہ کوئی سہیلی ہے۔ مس بے ہودگی۔" ملت دانت نکوستا کارپٹ پر ڈھے گیا۔

"کیوں جھگڑ رہے تھے تم دونوں۔" وہ ان کی ایکٹنگ پر جی بھر کر خفا ہونے کے بعد بولی۔

"چاچی! اس سے کہیں تندور سے روٹیاں لے کر آئے۔" ملت نے "وجہ فساد" اس کے گوش گزار کی۔ تندور پر جانا ان تینوں بھائیوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں تھا۔

"میں منیبہ منیر تندور پر کھڑا روٹیاں گنتا اچھا

لگیں گے۔ مستقبل کا بزنس مین، تم لوگوں کو شرم سے ڈوب جانا چاہیے۔" منہب تو صدمے سے نڈھال ہی ہو گیا۔

"ویسے بھی روزانہ چالیس روٹیاں خریدتے ہوئے ارد گرد کھڑے لوگ بھی مشکوک انداز میں پوچھنے لگتے ہیں۔ کہ کہیں "ڈھابہ" تو نہیں کھول رکھا۔ انہیں کیا پتا "پنجال پورہ" کی پوری کاسٹ ہمارے گھر میں موجود ہے۔ ابھی تو آدھے افراد تندور کی روٹی نہیں کھاتے' ان کے لیے گھر میں پھلکے اتارے جاتے ہیں۔"

"تو پھر آج مکس کے ساتھ ہوا کھا لینا۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"میں بالکل نہیں جاؤں گا۔" ملت نے صاف جھنڈی دکھا دی۔ "اس گھر کے لیے "روٹیاں" دھوتے دھوتے میں آدھا ہو چکا ہوں۔"

"چاچی! بات انصاف کی ہونی چاہیے۔ اب قاسم اور علی چھوٹے تو نہیں۔ ان کی بھی ہفتہ ہفتہ بھر ڈیوٹی لگائیں۔" نیم بھی "حقوق بچگان" کا نوٹس بورڈ اٹھائے نجانے کس کونے سے برآمد ہوا تھا۔ بات تو سچ تھی مگر کہنے کا حوصلہ کسی میں بھی نہیں تھا۔

"تم تینوں ہی رہنے دو۔ میں خود روٹی پکا لیتی ہوں۔ باہر ویسے بھی چلچلاتی دھوپ ہے۔ اماں بتا رہی تھیں۔ پچھلے سال نیم کو لگی تھی۔ ڈیڑھ مہینہ یہ بیمار رہا تھا۔" کچھ سوچ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"دیکھا — دیکھا — حاضرین چاچی نے فوراً" ہتھیار پھینک دیے ہیں۔ اوپر والوں کے سامنے بات کرنے کا کسی میں بھی حوصلہ نہیں۔ اب دو بجے کچن میں کھڑی ہوں گی اور شام سات بجے دوپہر کی روٹیاں پکا کر فارغ ہوں گی۔ ہے نا ناانصافی اور ظلم' اماں بی ان سب کے کچن کیوں نہیں الگ کرتیں۔" منہب چیخ کر بولا تھا۔ ملنہ تو دہل کر رہ گئی۔

"منہب۔" اس نے ناراضی سے ٹوکا۔ "گھر میں معمولی سی بات پر بدمزگی ہو یہ مجھے گوارا نہیں۔ آئندہ تم اس قسم کی کوئی بات نہیں کرو گے۔"

"آپ کو سب کی بے لوث خدمتیں کرنے کے بدلے میں کوئی ایوارڈ نہیں ملے گا۔ بڑی چاچیاں کس قدر آرام طلب ہو گئی ہیں۔ سارے گھر کی ذمہ داری آپ کے سر ڈال کر خود سیر سپاٹے کرنے نکل جاتی ہیں۔" ملت کے لہجے میں بھی واضح تلخی تھی۔ یہ بچے کس قدر حساس تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس شدت سے محسوس کرتے تھے۔

"اور ہم آپ کو یوں "خرچ" ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اتوار کے اتوار سب چاچیاں پہلے کی طرح ناشتا کھانا اپنی اپنی باری پر بنائیں گی یا بازار سے منگوائیں گی۔ آپ اعلانیہ کہہ دیں۔ کم از کم آپ کو بھی چھٹی کے روز آرام کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔" منہب نے ترشی سے کہا۔

"اس لاحاصل بحث کا کوئی مقصد بھی ہے۔" وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"میں لے آتا ہوں چاچی! آپ کو گھر میں روٹی پکانے کی ضرورت نہیں۔" منہب بائیک کی چابی دراز میں سے نکال کر باہر نکل گیا تھا جبکہ نیم اور ملت دونوں میز پر برتن سیٹ کرنے لگے۔

digest library.com

وہ اماں بی کے پیروں اور سر میں تیل لگا کر مانیہ کو آوازیں دینے لگی تھی۔

"جی چاچی!" مانیہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

"ادھر آؤ تمہارے بالوں میں تیل لگا دوں' کیسے خشک اور بے جان ہو رہے ہیں۔" اس نے زبردستی منمناتی مانیہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھایا۔

"چاچی! تیل کی اسمیل سے چھینکیں آئیں گی۔"

"ناک پر ہاتھ رکھ لو۔" مشورہ حاضر تھا۔

"ہاتھ تھک جائے گا۔" مانیہ معصومیت سے بولی۔

"دوسرا ہاتھ رکھ لینا۔" ملنہ نے ہنسی دبائی۔ کچھ دیر بعد نادیہ بھابھی سر باتی آ گئیں۔ "ملنہ! میرے سر میں بھی تیل کا مساج کر دو۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

"کردیتی ہوں۔" موت کی ماری ملیحہ نے سر ہلا دیا۔

"چاچی! مجھے بھی۔" محسن بھی بھاگا بھاگا آیا۔

"میں نے بھی کروانا ہے۔" قاسم کو بھی ترس آگئی۔ اپنی ماؤں کے تو ہاتھ نہیں آتے تھے۔ فہد محسن اور عمار بھی اس کار خیر میں شرکت کی غرض سے بھاگے چلے آئے۔

"بھاگو یہاں سے۔" نعیم ہمیشہ آڑے وقتوں میں کام آتا تھا۔

"بھیا! ہم نے چاچی سے آئل لگوانا ہے۔" بچے ٹھنکنے لگے۔

"اپنی ماؤں سے کہو۔" نعیم نے جھٹ پٹ تیل کی بوتل اٹھائی اور کیبنٹ میں چھپا آیا۔

"مما سے نہیں۔ چاچی سے لگوانا ہے۔" بچے مچلنے لگے۔

"کیوں تنگ کر رہے ہو بچوں کو۔" ملیحہ کو ان کے معصوم لٹکے چہرے دیکھ کر پیار آگیا۔

"رہنے دیں آپ۔" نعیم کو قطعاً" ترس نہ آیا۔

"لیجیے آپ کا کویت سے فون آیا ہے۔"

"تائی جی کا فون۔" ملیحہ کو اٹھنا ہی پڑا۔ بچے بے چارے منہ لٹکائے ایک دفعہ پھر کھیلنے کودنے لگے۔

ملیحہ نے ریسیور کان سے لگایا تو کال شاید ڈسکنیکٹ ہو گئی تھی یا پھر نعیم نے جھوٹ بولا تھا۔

"نعیم بھی نا۔" وہ ہنستے ہوئے سر جھٹکنے لگی۔ اسی پل فون کی گھنٹی بجی۔ چونکہ وہ پاس ہی کھڑی تھی اسی لیے دوسری بیل سے پہلے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

"لگتا ہے تم میرے فون کا انتظار کر رہی تھیں۔" ائیر پیس میں سے مہد کی آواز ابھری۔

"نہیں آپ کے فون کا نہیں' آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ برجستہ بولی۔ "آج آپ نے آنا تھا۔"

"آنا تو تھا مگر آؤں گا نہیں۔"

"کیوں؟"

"تیری مرضی۔" وہ شاید اسے چڑا رہا تھا اور ملیحہ واقعی چڑ بھی گئی۔

"مرضی آپ کی تھی آپ کی مرضی کی۔ سیدھی طرح گھر آجائیے۔"

"نہ آؤں تو پھر۔"

"میں پوری پلٹون کو لے کر آجاؤں گی۔" اس نے دھمکایا۔

"پلٹون کو ادھر ہی نہ لے آؤں۔ روز روز کی "ڈوز" سے نجات مل جائے گی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"گھر آکر مطلب سمجھاؤں گا۔ ابھی تم اماں کو فون دو۔"

"اماں! مہد سے بات کرلیں۔" اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھ کر اماں کو آواز دی۔ اماں تخت پر بیٹھی تھیں۔ وہ فون سیٹ اٹھا کر ان کے پاس لے آئی۔ پھر دھلے ہوئے کپڑے اٹھا کر اوپر چلی آئی۔ عادیہ بھابھی خرابی طبیعت کی وجہ سے آج دفتر نہیں گئی تھیں۔ وہ ان کے قریب ہی فلور کشن پر بیٹھ گئی۔ بھابھی بچوں کے یونیفارم استری کر رہی تھیں اسے آتا دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

"کیسی طبیعت ہے بھابھی۔؟"

"اب تو کچھ بہتر ہوں۔"

"آپ کے لیے کھچڑی بنائی ہے۔" ملیحہ نے انہیں بتایا۔

"شکریہ جناب۔" بھابھی کے لہجے میں تشکر تھا۔

"اماں کیا کر رہی ہیں۔" بھابھی نے کچھ رازداری سے پوچھا۔

"مہد سے بات کر رہی ہیں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اوں۔ ہوں' کوئی خاص بات۔" بھابھی ٹھٹکیں۔

"مجھے کیا پتا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"تم نے بات کی ہے مہد سے۔" کچھ سوچ کر بھابھی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ خیال نہیں رہا۔"

"تو اور سنو۔ میں تو انتظار کر رہی تھی۔" بھابھی کی آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

"بھابھی! ابھی بات کرنا کچھ مناسب نہیں۔ مہد کو شاید برا لگے اور اماں بھی خفا ہوں گی۔"

"اسی لیے تو تم سے کہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں مہد کی رائے لو۔"

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے ایک مرتبہ پھر انہیں تسلی دی۔

"ان سب کے بھلے کی بات ہے۔ میرا ذاتی مفاد تو کوئی نہیں۔" بھابھی اپنی اچھائیوں اور خاندان کی حشمت کے قصے سنانے لگی تھیں۔ ملیشہ تھوڑی دیر میں ہی بور ہو گئی۔ اور پھر اماں کو دوا دینے کا بہانہ کر کے نیچے اتر آئی۔

ابھی تین دن پہلے بھابھی صاحبہ نے اپنے ڈنمارک میں مقیم بھائی کا پرپوزل مانیہ کے لیے پیش کیا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی براہ راست اماں سے بات کر سکتی تھیں مگر انہوں نے نہ جانے کیوں ملیشہ کا انتخاب کیا تھا کہ وہ بات ہوم منسٹری تک پہنچائے۔ بہرحال ملیشہ اب ہامی بھر چکی تھی اسی لیے اس نے بلی بلی آواز میں بڑے مناسب الفاظ میں بھابھی کا مدعا بیان کر دیا تھا۔ اماں بی پہلے حیران ہوئیں اور پھر ان کی تیور بگڑنے لگے۔

"بہو! میری پوتی نہ تو عمر رسیدہ ہو رہی ہے۔ اور نہ تم پر ایسا کوئی بوجھ میں نے لادا ہے۔ جو تم اسے اتارنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی ہو۔"

"اماں۔" وہ تو ہکا بکا سے رہ گئی تھی۔

"میں نے ایسا کب کہا۔ اور میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی۔ اور مجھے تو نادیہ بھابھی نے آپ سے بات کرنے کے لیے کہا تھا میں تو خود کہہ رہی تھی کہ مانیہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"نہ اس کے اڑتیس سالہ بھائی کے لیے میری معصوم پوتی رہ گئی ہے۔" اماں بی تو آگ بگولا ہو گئیں۔

"میرا کیا قصور ہے؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میم سے بیاہ کر رکھا تھا اس نے۔" اماں نے غصے سے بتایا۔

"اسی لیے تو میں نے مہد سے بات نہیں کی۔ ویسے بھی مانیہ تو ابھی پڑھ رہی ہے۔" وہ منمنائی۔ لوگوں میں نہ شرم ہے نہ حیا۔ چندیا رینگنے سے جوانی لوٹ نہیں آتی۔" اماں بی رات تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔ اور اس وقت کو ملیشہ کوس رہی تھی جب اس نے نادیہ بھابھی کی باتوں میں آکر اماں بی کو اشتعال دلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

مہد نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ان سب کو کراچی لے کر جانا چاہتا ہے۔ اماں بی نے سنا تو فوراً انکار کر دیا۔

"اپنی جورو کو لے جاؤ۔"

"جورو کے ساتھ ہم بھی جائیں گے۔" ملت ہنکارا۔

"اماں! ماں لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے کھانے پینے کی سخت پرابلم ہے۔" مہد نے اماں کو قائل کر کے دم لیا تھا۔ وہ اپنا آبائی گھر چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں مگر مہد کے اصرار اور کچھ اپنا آرام بھی مطلوب تھا سو اسی لیے انہیں ماننا ہی پڑا کہ جانتی تھیں یہاں پر کسی نے ملیشہ کی طرح خدمتیں نہیں کرنی جن کی دعاؤں ہو چلی تھیں۔

بچے بھی بے حد ایکسائیٹڈ تھے سو سب نے بہت جوش و خروش کے ساتھ پیکنگ مکمل کی۔ اگلی صبح وہ لوگ کراچی پہنچ گئے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کی شادی کو تیسرا سال لگ گیا تھا۔ فلیٹ اگرچہ چھوٹا تھا مگر تھا بہت اچھے ایریے میں۔ سب سے پہلے بچوں کے ایڈمیشن کروائے گئے۔

ملت اور نعیم کالی بی اے کرنے کا ارادہ تھا۔ منہب نے پونی ورسٹی جوائن کر لی تھی۔ مانیہ کا قریبی کالج میں باآسانی داخلہ ہو گیا۔

روٹین لائف سیٹ ہوتے ہوتے دو ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اس دوران مامی اور نازنین نے ان کا بہت ساتھ دیا۔ روزانہ مامی اور نازنین شام کو آجاتی تھیں۔ اماں بی بھی بہت خوش تھیں۔ انہوں نے بہت جلد اردگرد کے لوگوں سے دوستیاں گانٹھ لیں۔

نئی جگہ اور نیا گھر تھا۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ اچھی

طرح ایڈجسٹ کر رہے تھے۔

دن گزرتے کہاں پتا چلتا تھا۔ وقت کے تھل میں سال سکون کی مانند گرنے لگے تھے۔ اس دن وہ صبح قدرے تاخیر سے اٹھی تو فہیم نیا کلینڈر دیوار پر چسپاں کر رہا تھا۔

"ارے ایک سال گزر بھی گیا۔ ابھی کل کی بات ہے جب ہم لوگ یہاں آئے تھے۔" وہ حیرانی سے سوچتی رہ گئی۔

"پھوچک کی شادی ہو گئی۔" ملت نئے سال کی نئی خبر جوش و خروش سے سنا رہا تھا۔

"کس کے نصیب پھوٹے ہیں۔" منہب پودوں کو پانی دیتے ہوئے پلٹ کر پوچھنے لگا۔

"بشیر صاحب کے چوکیدار کے۔"

"بے چارا شبیر عشق میں مارا گیا۔" ملت نے اظہار افسوس کیا۔

"چاچو سے بات کرو، ہمیں اس کا ولیمہ اٹینڈ کرنا چاہیے۔" فہیم پر سوچ لہجے میں کہنے لگا۔

"پتا تو ہے اس چورنی کو چاچی نے نکال دیا تھا۔" منہب کو اچانک یاد آیا۔

"چاچی، پلیز نا شتا دیں۔" ملت نے دہائی دی۔

"پہلے جا کر مانیہ کو سینٹر سے لے آؤ۔" ملشاء نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ مانیہ قریبی سینٹر سے فلاور اریجمنٹ کا کورس کر رہی تھی۔

"خود ہی آجائے گی۔" ملت نے سستی سے کہا۔

"روزانہ اکیلے ہی تو آتی ہے۔"

"اماں کو چھڑی تو دے آؤ۔" وہ پلیٹ اٹھائے باہر آ گئی۔

"ادھر لائیں۔" فہیم ٹھنڈا پانی لیے آ گیا۔

"منہب! تم مانیہ کو لے آؤ۔ کم از کم چھٹی کے روز تو مانیہ کو لے آیا کرو۔" وہ ناراضی سے انہیں جھاڑتے ہوئے بولی۔

"بہتر چاچی!" وہ فرمانبرداری سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا، اسی پل مانیہ لال بھبھو کا چہرہ لیے اندر آ گئی۔

"السلام علیکم! ہم تو آپ کو لینے جا رہے تھے۔" منہب نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کر لیا۔

"چاچو کہاں ہیں؟"

"اماں کی دوائیاں لینے گئے ہیں۔" فہیم نے مصروف سے انداز میں سلاد کے لیے فروٹ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

ملشاء کچن سے باہر آئی تو مانیہ کو کارپٹ پر سر جھکائے گم سم بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"مانی! کیا بات ہے؟" اسے کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں چاچی!" وہ گڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

"کوئی بات تو ہے۔ تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔" وہ یقین سے گویا ہوئی۔

"نہیں تو۔" مانیہ نے دانستہ مسکرانے کی کوشش کی۔

"[illegible] میرے ساتھ غلط بیانی [illegible]"

"نن نہیں چاچی۔"

"میرے کمرے میں آؤ فوراً۔" وہ اٹھ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھی۔ کچھ دیر مانیہ بھی سر جھکائے سوچوں میں گم چلی آئی۔

"اب بتاؤ کیا پرابلم ہے؟ میں تمہاری دوست ہی نہیں ماں بھی ہوں۔ جھجکو مت، جو کچھ دل میں ہے کہہ دو۔" اس نے پیار سے نرمی سے اس کا اعتماد بحال کیا تھا۔ جبھی تو وہ لرزیدہ آواز میں کہنے لگی تھی۔

"بڑی چاچی کے بھائی ہیں نا۔ بنکاک والے، اکثر موبائل پر فون کرتے ہیں۔"

"کیوں؟" اس کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

"وہ کہتے ہیں۔ میں ان سے شادی کر لوں۔" مانیہ معصومیت سے بولی۔

"تم نے پھر کیا کہا؟"

"میں نے انہیں صاف صاف بول دیا ہے کہ چاچی اور اماں سے بات کریں۔"

"ہوں۔ تو یہ بات ہے۔" وہ پر سوچ انداز میں سر ہلا

digest library.com

کر بولی۔ "تم نے دیکھ رکھا ہے نا جمال صاحب کو۔ تمہارے منہاج چاچو جتنے ہوں گے۔ تمہارا کیا خیال ہے ان کے بارے میں۔" ملشہ نے بہت ہی دوستانہ لب و لہجے میں نرمی سے پوچھا۔

"مجھے نہیں اچھے لگتے وہ۔" مانیہ نے ناک چڑھائی۔

"آئندہ ان کا فون مت سننا۔"

"مگر چاچی! وہ دھمکیاں دیتے ہیں کہ چاچو کو بتادیں گے۔" اس نے روہانسے انداز میں اصل وجہ بتائی۔

"اِ۔ تو بلیک میل کرنے کی کوششیں۔" وہ ناگواری سے سوچتی رہی۔ "تم پریشان مت ہو۔ میں معاملہ سنبھال لوں گی۔" ملشہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ اور پھر واقعی اس نے بہت احسن طریقے سے بھابھی کو ان کے بھائی کے کارنامے بتائے اور معاملے کی سنگینی کے متعلق دھمکایا۔ وہ دل ہی دل میں تلملاتے ہوئے اس کی کڑوی کسیلی باتیں سنتی رہیں۔ بہرحال جمال صاحب کے فون آنا بند ہوچکے تھے۔ اور انہوں نے مانیہ کے حصول کی کوششیں ترک کرکے ایک بیوہ سے نکاح کرلیا تھا۔

ملشہ نے سنا تو گویا اک بھاری بوجھ سے آزاد ہوگئی۔

مانیہ کے سیکنڈ ایئر کے پیپرز ہورہے تھے۔ اماں کو اس کے رشتے کی فکر لاحق ہوگئی۔ حالانکہ مہد بھی ابھی مانیہ کی شادی کے حق میں نہیں تھا مگر اماں کے اصرار اور ضد کی وجہ سے وہ خاموش ہوگیا۔

ان دنوں اس کے لیے کیپٹن ساعد کا پرپوزل آیا تھا جسے متفقہ طور پر قبولیت کی سند بخش دی گئی۔

گھر میں شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ مہد نے مانیہ کی شادی بہت دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی کے سلسلے میں مانیہ کے بڑے چچا وں نے دس دس ہزار کے چیک دے کر گویا اپنا فرض ادا کردیا تھا۔ اماں بی اس موقع پر خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔

انہوں نے بیٹوں کو خوب خوب شرمندہ کیا تھا مگر وہ بھی بڑھتی مہنگائی، اخراجات کی پوری تفصیل رٹ کر آئے تھے۔

مانیہ رخصت ہوگئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ملشہ کو تنہائی کا احساس ستانے لگا تھا۔ حالانکہ وہ بہت کم گو تھی۔ اس کے باوجود اس کی موجودگی سے خوب رونق کا احساس ہوتا تھا۔ لڑکے تینوں پورا دن باہر گزار کر شام کو گھر آتے تھے۔ ان کی اپنی بہت سی مصروفیات تھیں اماں بھی زیادہ اردگرد کی سہیلیوں میں مصروف رہتیں۔ رہا مہد تو وہ نجانے کیوں الجھا الجھا سا پریشان اور تھکا تھکا سا لگنے لگا تھا۔ ملشہ کے بہت دفعہ پوچھنے پر ہنس کر ٹال دیتا۔ مگر ایک روز ملشہ کو اس کی پریشانی کی وجہ معلوم ہوگئی۔

"سات لاکھ قرض اور نوکری بھی چھوٹ گئی۔" وہ فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ مہد جس کمپنی میں جاب کرتا تھا وہ دیوالیہ ہوگئی۔ فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھی مل گیا تھا اور اس بڑھتی مہنگائی میں وہ ہر اماں سی بدلتے وقت کی کروٹوں میں چھپی اذیتوں کو محسوس کرتی رہی۔ دس دن کی تگ و دو خواری کے بعد معمولی سا مکان سات ہزار ماہانہ کرائے پر مل گیا۔ تھوڑی بہت رقم موجود تھی۔ سو وہ خاموشی سے اس آثار قدیمہ کے مکان میں آگئے۔ اماں تو مکان کی خستہ حالی کو دیکھ کر چیخ اٹھیں۔

"یہ کہاں لے آئے ہو مہد! ارے ہوا کے زور پر چھتیں ہلنے لگتی ہیں۔ کسی روز آگریں گی ہمارے اوپر۔" انہیں پرانی سہیلیوں کے چھوٹنے کا بھی غم تھا۔ وہ یہاں آکر سخت غم و غصے کا شکار تھیں۔ کچھ وہ عمر کی اس حد میں تھیں کہ بات بہ بات چڑنے لگتیں۔ جھگڑنے لگتیں نہ انہیں کھانا پسند آتا نہ ہی موجودہ رہائش۔

مہد کو بہت کوششوں کے بعد پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ پر ملازمت ملی گئی تھی۔ ملشہ نے بھی ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرلی۔ اسے سات ہزار تک سیلری مل جاتی تھی۔ مگر زندگی کا یہ مشکل ترین دور تھا۔

اک طویل تھکا دینے والے مشقت بھرے دن کا آغاز اماں کی پھٹکار، کوسنوں اور جھگڑے سے ہوتا تھا۔ گھر کے کام، لڑکوں کے کپڑوں کی دھلائی وغیرہ، اماں کا

پرہیزی کھانا۔ اسکول سے آکر وہ گھن چکر بن جاتی۔ مہد خود دو دو جگہ کام کر رہا تھا۔ منہب انہی دنوں ایک دوست کے توسط سے باہر چلا گیا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد اس نے فہیم اور ملت کو بھی بلوا لیا۔ ملت اور فہیم جانا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اچھے مستقبل کی خواہش نے آگے بڑھنے کی لگن پیدا کر دی تھی۔ پھر ان کے سامنے وسیع جہاں تھا۔

مہد نے انہیں اچھی طرح سمجھا بجھا کر بھیجا تھا۔

"اپنی پڑھائی پر توجہ دینا۔ ادھر کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ابھی تم لوگ اتنے باشعور نہیں ہو۔ کمائی کے چکروں میں پڑو گے تو تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ میں تم تینوں کو اعلا مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

بچے چلے گئے تو گھر میں ویرانیاں اتر آئیں۔ ماسیہ کبھی کبھار رہنے کی غرض سے آ جاتی تھی۔ اماں کے وہی روز و شب تھے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی تھیں۔

اگلے دو سال کس مشکل اور کٹھن ترین مرحلوں سے گزر کر انہوں نے ماسیہ کی شادی کا سلسلے میں لیا جانے والا قرض اتارا تھا۔

مہد کی تنخواہ میں بمشکل گزر بسر ہو رہی تھی۔ جبکہ ملشہ کے سات ہزار تو کرائے میں چلے جاتے تھے۔ اماں کی دوائیاں' ان کے لیے سوپ' جوسز' فروٹ اور گوشت' دودھ وغیرہ پر بچت کی رقم آرام سے خرچ ہو جاتی۔

کبھی کبھار تو مہد اور اسے اچار اور چٹنی کے ساتھ روٹی نگلنا پڑتی تھی۔ اماں اپنی خوش خوراکی کی وجہ سے چاق و چوبند تھیں۔ ان کی زبان کے جوہر شادی کے آٹھ سال بعد ملشہ پر اچھی طرح آشکار ہو گئے تھے۔

ویسے بھی کسی نے سچ ہی کہا تھا کہ مشکل وقت میں اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اس بوجھل' تکلیف دہ پرمشقت دنوں میں ہوا کا ٹھنڈا اور نم جھونکا جیسی اس خبر نے مہد اور اسے حیران' ششدر اور بے تحاشا خوشی سے ہمکنار کر دیا تھا۔

وہ ماں بننے والی تھی۔ آٹھ سال گزر گئے تھے اس ایک خبر کو سننے کے لیے کان ترس رہے تھے۔ دلوں میں حسرتیں تھیں اور آنکھوں کی جوت ماند پڑ رہی تھی۔

"بی بی! ہم تو مایوس ہی ہو چکے تھے۔" اماں بھی حیران تھیں۔ ملشہ اپنی خوشی اور جنون میں ان کے لہجے کے مفہوم پر خود کو الجھانے کی بجائے ان دنوں خوش تھی بے تحاشا خوش۔

مہد کی ضد اور اصرار پر اس نے جاب چھوڑ دی تھی۔

نو مہینے کے انتظار کے بعد اللہ نے انہیں اپنی رحمت سے نوازا تھا۔ ننھی شفق کی آمد نے ان کی بے رنگ زندگیوں میں رنگ ہی رنگ بھر دیئے تھے۔

منہب' فہیم اور ملت کے فون روزانہ ہی آتے۔ وہ اپنی چھوٹی سی کزن کو دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

ملشہ کو اک ننھا منا سا جیتا جاگتا کھلونا مل گیا تھا۔ وہ پورا دن اپنی بیٹی کو سجانے سنوارنے میں مصروف رہتی۔

کبھی اسے نہلاتی کبھی سریلیک کھلاتی۔ کبھی شفق کے لیے کھچڑی پکانے لگتی۔ کبھی دلیہ بناتی اس کے لیے چھوٹی چھوٹی فراک سیتی۔ لیسوں پر ستارے ٹانکتی۔

اس پل ملشہ کی اپنی آنکھیں ستاروں سے گویا بھر جاتی تھیں۔

مہد اس کی دیوانگی دیکھ کر مسکراتا رہتا تھا۔

"کیا سارا پیار شفق پر لٹا دینا ہے۔ یہ چھ فٹ گیارہ انچ کا آدمی نظر نہیں آتا۔"

"میری بیٹی سے جیلس ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ شفق کی اجلی پیشانی کو چوم کر کہتی۔

"صرف تمہاری۔" مہد چیخ اٹھتا۔

"یہ چیٹنگ کیوں؟؟" وہ ناراضی سے پوچھتا۔

"بیٹیاں باپ کی ہوتی ہیں اور بیٹے ماں کے۔ تم اپنے لیے اور بندوبست کر لو۔"

"جائیے اپنا راستہ ناپیے۔ میرے اور میری بیٹی کے پیار کے بیچ دیوار چین بننے کی ضرورت نہیں۔" وہ شاہانہ انداز میں جتاتی۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں اور بے بی کی ضرورت

نہیں۔" وہ کچھ ناقابل فہم لہجے میں بولا۔

"نہیں۔" ملشہ نے قطعیت سے کہا۔

"ہوں۔" مہد نے محض ہنکارا بھرا۔ اس کے دل پر سے اک نادیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا۔ بیٹی کی پیدائش کے دوران کچھ پیچیدگی کی وجہ سے وہ مزید ماں نہیں بن سکتی تھی۔ یہی بات مہد اس سے چھپائے کافی مضطرب تھا۔ مگر اب وہ مطمئن ہو چکا تھا۔ تبھی اس نے ملشہ کو سچائی بتادی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنتی رہی تھی۔ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے پاس شفق موجود تھی اس کی پوری کائنات۔

شفق نے پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیا۔ اس کے لبوں سے نکلنے والا پہلا لفظ "ماں" تھا۔

شفق کی مسکراہٹ، اس کی ہنسی، آنسو۔ وہ تو گویا بیٹی کی ایک ایک ادا پر قربان ہو جاتی تھی۔

"تم بھی کیا دیوانگی۔" ماں کو محبت کے ان مظاہروں سے بہت چڑ تھی۔ وہ اس پیاسی عورت کے صحرا دل کی کیفیات سے قطعاً "نا آشنا" تھیں۔

شفق کی اسکولنگ شروع ہوئی تو ساتھ ہی مہد کے ٹرانسفر آرڈر آ گئے۔ اماں بی نے گویا سکھ کی سانس لی تھی۔

کچھ ہی دن تک وہ اپنے آبائی شہر آ گئے تھے۔ یہاں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بس منہب، مہیم اور ملت نہیں تھے۔

گھر کی حالت نہایت خستہ تھی۔ گندگی کے ڈھیر اور دھول مٹی سے اٹا فرنیچر۔ ابھی تک اماں بی کی بہویں نیچے والا کچن استعمال کرتی تھیں۔

شفق یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ اس کے ہم عمر اور کچھ بڑے سائز کے ہر طرح کے بچے موجود تھے۔ وہ تتلی کی مانند اڑتی پھرتی تھی۔ ملشہ بیٹی کو خوش دیکھ کر خود بھی مسرور ہوتی رہتی۔

☼ ☼ ☼

منہب نے ایک انگریز مسلم لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ ملت نے ایک ہفتہ پہلے اطلاع دے کر انہیں باخبر کر دیا تھا۔ ملشہ کو اک عجیب سے احساس زیاں نے گھیر لیا۔

"کم از کم منہب مجھے تو مطلع کر دیتا۔" وہ کافی رنجیدہ تھی۔ مہد کے استفسار پر اس نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔

"منہب نے مجھ سے پوچھا تھا۔ گرین کارڈ اس کی مجبوری تھی۔ پھر وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار ہے۔ اور ہم بچوں کی خوشی میں خوش۔ مجھے تو آج تک یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ بچے میرے بھائی کی اولاد ہیں۔ مجھے ان سے اپنی اولاد کی طرح کا پیار ہے۔" منہب نے شفق کے لیے ڈھیروں کھلونے، کپڑے اور دیگر ضرورت کی بے حد اشتعال انگیز چیزیں بھجوائی تھیں۔ اصل فساد اسی وجہ سے شروع ہوا تھا۔ بسمہ اور نادیہ جلبلاتی رہی تھیں۔ مگر اس میں نہ شفق کا قصور تھا نہ ملشہ کا۔ مہد نے جھگڑا ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"تم کچھ چیزیں ان سب میں بانٹ دو۔"

"ٹھیک ہے۔" ملشہ خود بھی ہنگامہ اور بد مزگی نہیں چاہتی تھی۔ مگر اوپر والوں کے مزاج تو وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔

"ہمیں خیرات نہیں چاہیے۔" نادیہ بھابھی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ گھنٹے ان کی فضولیات سن سن کر اس کا دماغ دکھنے لگا۔ نیچے آئی تو اماں نے الگ سے ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔

"میری لال مہندی کا پیالہ الٹ دیا ہے اس چھٹکی نے۔" وہ شفق کو خوب کوس رہی تھیں جو کہ فرش پر گری مہندی سے ہاتھ رنگنے میں مصروف تھی۔

"یہ میری ہے۔ یہ میری ہے۔" ملشہ نے اسے ڈانٹ کر فرش کپڑے سے صاف کیا تو شفق نے رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔

"میں نے مہندی (مہندی) لگانی ہے۔ یہ میری ہے، مجھے دو۔ ماما مجھے دو۔" وہ فرش پر پاؤں پٹختی رہی۔ ملشہ نے پیالہ اٹھا کر کچن میں رکھا اور شفق کو گود میں لیے اس کے ہاتھ دھلوانے لگی۔

"بابا کو بتاؤں گی۔ ماما گندی ہیں، دادو گندی ہیں۔" وہ

مسلسل چیختی رہی۔

"جا جا! باوا کو بتا دے۔ میں نہیں ڈرتی ورتی تیرے باوا سے۔" اماں بھی خوب مقابلہ کیے جاتی تھیں یہاں تک کہ شفق رو رو کر چپ کر جاتی۔

"اس کے حلق میں تو ہنٹوی نٹ ہے۔ کم بخت چلائے جاتی ہے۔ سیل نہیں رکتے اس کے۔" وہ بے زاری سے کہتیں۔

"آپ کے سیل نہیں رکتے۔" شفق کی ایک عادت بہت پختہ ہو چکی تھی جو کچھ وہ بڑوں کے منہ سے سنتی تھی مسلسل دہراتی رہتی۔ ملیحہ کے غصہ کرنے مارنے ـــــ پر بھی وہ باز نہیں آتی تھی اگر وہ مہد سے شکایت کرتی تو وہ آرام سے کہہ دیتا "وقت کے ساتھ ساتھ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ملیحہ! سنبھالے اس چھٹکی کو، ورنہ لگاؤں گی دو ہاتھ۔" اماں جابلانے لگیں۔

"میں بھی لگاؤں گی دو ہاتھ۔" شفق بھی پورے جوش کا مظاہرہ کرتی۔

"آلے تیرا باوا، بتاتی ہوں اسے تیری بدزبانی کے متعلق۔" اماں بھی زچ ہو جاتیں۔

"آپ کے باوا کو بھی بتاتی ہوں۔ آپ گندی ہیں داود گندی ہیں۔" وہ گیت گاتی پھر رہی تھی اور اماں بی کی توپوں کا رخ ملیحہ کی طرف ہو گیا۔

"بڑی اچھی تربیت کر رہی ہو۔ یہ ہے چومنے چاٹنے کا انجام۔"

"اماں! بچی ہے۔ سمجھ جائے گی۔" وہ دبی آواز میں صفائی دینے لگی۔

"نہ جی نا۔ یہ نہیں سمجھنے والی۔ پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آجاتے ہیں۔ چونڈے میں خاک ڈلوائے گی۔ ذرا آگ تو لینے دو اسے۔"

"خدا نہ کرے۔" ملیحہ نے دہل کر دل ہی دل میں بے ساختہ کہا "اماں بھی حد کرتی ہیں۔" اسی وقت مہد بھی آ گیا تھا۔ اور شفق قلانچیں بھرتی باپ سے لپٹ گئی۔

"داود ڈانٹتی ہیں۔" اس نے شکایت لگائی۔

"آپ نے تنگ کیا ہوگا دادو کو۔"

"نئیں۔ صرف ہمنڈلی (مہندی) لی تھی۔"

"پیالہ الٹ دیا تھا اس نے مہندی کا۔" وہ غصے سے بھری بیٹھی تھیں ایک دم شروع ہو گئیں۔

"میرے بابا اور لا دیں گے۔" شفق شاہانہ انداز میں بولی۔

"فیکٹریاں چلتی ہیں نا تیرے باوا کی۔"

"اماں! بس بھی کریں۔" مہد نے ناگواری سے ٹوکا۔

"نواب 'ماں' کا بولنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ یوں کرو' میرا منہ کپڑے سے باندھ دو' یا ٹیپ چپکا دو۔" وہ اور تنتنا اٹھیں۔

"نہ بولوں گی نہ بات بڑھے گی۔ سارا فساد اس نگوڑی زبان کا ہی تو ہے۔"

"ملیحہ! اماں کے لیے کھانا لاؤ۔"

"کھا لیا ہے میں نے دال کا ملغوبہ۔" وہ سخت بے زار تھیں۔

"اماں! آپ کے لیے پرہیز اب ضروری ہے۔ ذرا سی بدپرہیزی کے بعد رات بھر تکلیف سے بے چین رہتی ہیں۔" مہد نے نرمی سے سمجھایا۔

"ہاں ہاں' رات بھر تمہاری جورو کو جاگنا جو پڑتا ہے بیوی کے بغیر نیند کیوں آنے لگی ہمارے صاحبزادے کو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ خفت زدہ ہو گیا۔

"میں سب سمجھتی ہوں۔ کیوں خود پر جبر کرتے ہو۔ جب باقیوں سے فیض نہیں ملا سکھ نہیں پایا' نہ ہم نے شکوہ کیا نہ شکایت۔ تو تم بھی ہری جھنڈی شوق سے دکھا دو۔ لبوں پر قفل لگا دیں گے۔ کسی کو "فرمانبردار" بیٹوں کی اصلیت نہیں بتائیں گے۔" وہ سیب کی قاشیں کھاتے ہوئے ناراضی سے گویا ہوئیں۔

"یہ دودھ کے ساتھ دوا کھا لیجیے گا۔" مہد اٹھتے ہوئے تاکیداً بولا۔

"کھاؤں گی۔ ساری دوائیں کھاؤں گی۔ گولیاں پھانکنے کے علاوہ اور بھی کوئی کام ہے مجھے۔"

digest library.com

"اماں! آپ کے پلنگ کے قریب میز پر میں نے فروٹ، سپرائیٹ کی بوتل اور بسکٹ رکھ دیے ہیں۔ بھوک لگے تو کچن میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ملشہ مصروف سے انداز میں پھیلاوا سمیٹتے ہوئے بولی۔

"مہربانی آپ کی۔"

"اماں! ایک بات کہنا تھی۔" وہ چیزیں ٹھکانے پر لگا کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"صاف صاف بات کیا کرو۔ پہلے ہزار تمہیدیں باندھنے لگتی ہو۔" اماں کو اس کی ہر بات پر اعتراض رہنے لگا تھا۔

"اماں! دراصل تائی اور تایا جی کراچی آ چکے ہیں۔ کل وہ ادھر آئیں گے ہمارے پاس پھر بجوت جائیں گے۔ میں بھی کچھ دنوں کے لیے بجوت چلی جاؤں بارہ سال ہو چکے ہیں۔ میں تو وہاں کے راستے بھی بھولنے لگی ہوں۔"

"نہ بی بی! ہم نے تو ایک دن بھی پابندی نہیں لگائی۔ نہ منع کیا میاں سے کہنا تھا وہ ہر سال ہی لے جاتا۔" وہ بے نیازی سے بولی تھیں۔ ملشہ انہیں جتا نہیں سکی تھی کہ ان بارہ سالوں میں فرصت کا کون سا لمحہ اسے میسر آیا تھا کہ وہ میکے والوں کو دو گھڑی یاد ہی کر لیتی۔

"تائی جی صرف بیس دنوں کے لیے کویت سے آئی ہیں۔ یہاں سے انہوں نے جدہ جانا ہے۔ میں اتنے دن ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

"شوق سے رہو۔ ہم منع کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ اگر وہ مل جائیں گی تو پھر ننھی سی بچی کو لے کر خوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ کوئی نہ کوئی اعتراض اٹھاتی رہتی تھیں ملشہ دل مسوس کر رہ گئی۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے مہد سے ذکر کیا تو وہ کافی دیر سوچتا رہا تھا پھر بولا تو لہجے میں محسوس کی جانے والی نرمی تھی۔ جو اس کی شخصیت کو نکھار بخشتی تھی۔

"اماں کو کسی نے ۔ وقت پر دوا دینی ہے نہ خوراک۔ مجھے آفس سے چھٹی ملنا مشکل ہے ورنہ دو تین دن میں گھر میں اماں کی دیکھ بھال کر لیتا۔ دوسرے شفق کیسے اس پسماندہ علاقے میں رہے گی۔ موسم بھی گرمی کا ہے۔ بچی بیمار ہو جائے گی۔ بہرحال میں تمہیں جانے سے روک نہیں رہا۔"

"اپنی بھاوجوں کو دیکھا ہے۔ بڑھاپے میں بھی میکے کی دہلیز کے درشن کرنے سے باز نہیں آتیں۔ بچے جوان ہو گئے ہیں مگر ان کی روٹین میں فرق نہیں آیا اور ایک میں ہوں بارہ سالوں میں پہلی مرتبہ جانے کا نام لیا ہے تو سو طرح کے مسائل منہ کھولے کھڑے ہیں۔" ملشہ سخت کبیدہ خاطر ہو رہی تھی۔

"غصہ مت کرو۔ تائی جی کو آنے تو دو پھر چلی جانا۔ میں تمہیں منع نہیں کر رہا۔" مہد نے نرم آواز میں کہا تھا۔ اس کے لہجے کی ملائمت نے ملشہ کے غصے کا گراف لمحوں میں گرا دیا تھا۔ ہمیشہ ایسے ہی تو ہوتا تھا۔ اسی طرح تو ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اور پہلوؤں پر غور کرنے لگی۔

"بجوت میں گرمی کا موسم عروج پر ہے اے سی بھی نہیں، یو پی ایس کی سہولت بھی نہیں مچھر بھی ہوں گے۔ کہیں شفق بیمار نہ پڑ جائے پھر اماں کا مسئلہ بھی ہنوز برقرار ہے۔ انہیں باتھ روم کون لے کر جائے گا۔ دوا، کھانا پینا اور سب سے بڑھ کر ان کی ٹانگ پر مالش کون کرے گی۔ مجھے اپنا پروگرام ملتوی کر دینا چاہیے۔" وہ فیصلہ کر چکی تھی اماں کو واش روم میں پھسلنے کی وجہ سے ٹانگ پر چوٹ لگ گئی تھی جس کی وجہ سے انہیں چلنے پھرنے میں دقت کا سامنا تھا۔

اگلی شام تایا جی اور تائی دونوں بھاری بھرکم سامان ہمراہ لیے آ گئے تھے۔ یہ سب تحائف شفق کے لیے اور اپنی سہیلی کے لیے تائی جی لائی تھیں۔ تائی جی بہت کمزور اور کافی بوڑھی ہو چکی تھیں۔

وہ پورا ایک ہفتہ اس کے پاس رہی تھیں۔ ان دنوں ملشہ بہت خوش تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسرت کی کرنیں نکل کر اس کے چہرے کو روشن کر رہی تھیں۔

جانے سے پہلے تائی جی نے اس سے تنہائی میں پوچھا۔

"چندا! تو خوش ہے۔ میرا انتخاب غلط تو نہیں' میں نے قمر پر بھروسہ کر کے تیرے ساتھ زیادتی تو نہیں کی۔"

"میں بہت خوش ہوں تائی جی!" وہ انہیں ہر طرح سے مطمئن کر چکی تھی۔ تائی جی بچوریت میں بیس دن رہنے کے بعد واپس کویت چلی گئی تھیں جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر وہ دن اس کے پاس رہیں۔ مہد انہیں ایرپورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔ رات کو جب ملشہ کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی تو مہد کے سینے پر شفق لیٹی سو چکی تھی اس نے احتیاط سے شفق کو بیڈ پر لٹایا تھا پھر خود گھوم کر دوسری طرف بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔

"تمہاری شکایتیں تو خوب لگائی ہوں گی۔" مہد کا ہاتھ کچھ دیر بعد اس کے بازو پر سرسرانے لگا۔

"ایں۔ کیسی شکایت؟" وہ چونکی۔

"اب بنو نہیں۔ خالہ کو اماں کے رویے کے متعلق تو ضرور بتایا ہوگا۔" مہد نے وثوق سے کہا۔

"میں آپ کو شکایتی ٹٹو یا چغل خور لگتی ہوں۔" ملشہ ناراضی سے گویا ہوئی۔

"ارے میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں۔" وہ جھنجلایا۔ "مگر تم نے اماں کی زیادتیوں کے متعلق تو ضرور بتایا ہوگا۔"

"کیسی زیادتیاں؟" وہ حیران ہوئی۔ "اماں میری ماں ہیں اگر غصے میں کچھ کہہ لیتی ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں سب کے سامنے ڈھنڈورا پیٹتی رہوں۔ ویسے بھی اماں جیسے لوگ تو نیت کے کھرے اور دل کے صاف ہوتے ہیں۔" اس کی آواز میں بلا کی نرمی تھی۔

بہت سال تک وہ بھی اماں کو دل کا صاف اور نیت کا کھرا ہی سمجھتا رہا تھا۔ ہمدرد' پرخلوص اور احساس کرنے والی۔ مگر کھرے اور کھوٹے کی پہچان آزمائش کی بھٹی میں جلنے کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ اور آزمائش پر کوئی کوئی پورا اترتا ہے۔

"آپ نے ایسا سوچا بھی کیوں؟" وہ کافی ناراضی سے کروٹ بدلے مہد کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"غلطی ہو گئی ہے۔ معاف کر دو۔"

"مجھے آپ کے خیالات جان کر افسوس ہوا ہے۔ یعنی آپ نے مجھے اس قدر گھٹیا نیچر کا سمجھا ہے۔" اس کا ملال کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ تم اپنی ساس کے معاملے میں اتنی حساس ہو۔" مہد نے اس کی ناک ہولے سے دبائی۔

"اماں میرے لیے کیا ہیں۔ یہ میں آپ کو لفظوں میں نہیں بتا سکتی۔ اماں کے لیے میرے دل میں بہت عقیدت ہے۔ بہت محبت ہے۔ میں ابھی تک حیران ہوں کہ چند سطروں کے ایک خط کو پڑھ کر اماں نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ تائی جی اماں کی سہیلی تھیں مگر کیا کوئی دوستی میں اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہے۔ اپنے وجیہہ سے بیٹے کے لیے ایک عام سی لڑکی کا انتخاب کرنا۔ یہ بہت اعلا ظرفی کی بات ہے۔ اماں جتنا چاہے مرضی غصہ کر لیں مگر انہوں نے کبھی مجھے یہ نہیں جتایا کہ وہ کسی احسان کے بدلے میں مجھے لے کر آئی تھیں۔ میں تو۔" شدت جذبات میں اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اور ادھر مہد کو اسے ستانے کا ایک اور موضوع مل گیا۔

"اچھا تو تم نے تسلیم کر لیا ہے کہ میں بہت وجیہہ ہوں اور تم عام سی ہو۔"

"بہت وجیہہ نہیں صرف وجیہہ اور میں تو بہت ہی زیادہ خوبصورت ہوں' آپ کو سننے میں غلطی ہوئی ہے۔" ملشہ بھی صاف مکر گئی۔

"اتنا بڑا سفید جھوٹ۔" مہد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"آہستہ بولیے شفق اٹھ جائے گی۔" اس نے کسمساتی شفق کو ہولے سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"پہلی بہو دیکھی ہے جسے ساس سے کوئی شکوہ نہیں' شکایت نہیں۔" وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔

"خاموشی سے سونے کی تیاری کریں۔ صبح دفتر سے ہمیشہ لیٹ ہو جاتے ہیں۔"

"تم آؤ تو سہی' بقول اماں کے جورو کے بغیر نیند کہاں آتی ہے۔" مہد نے شرارت سے کہا تو ملیحہ اسے گھورتی رہی تھی پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆ ☆ ☆

"ماما نومی نے مجھے پھر سے مارا ہے۔" روتی بسورتی شفق اس کے دوپٹے کا پلو تھام کر منمنائی۔

"آپ کیوں اوپر گئی تھیں۔ میں نے منع کیا ہے نا نومی کے ساتھ نہیں کھیلنا۔" ملیحہ نے شفق کو بری طرح ڈپٹا تو وہ اور شدت سے رونے لگی۔

"میں کس کے ساتھ کھیلوں۔؟"

"باربی کے ساتھ کھیلو۔" ملیحہ نے پچکارا۔

"باربی گندی ہے۔ میں بھاگتی ہوں تو مجھے پکڑتی بھی نہیں۔" شفق بسوری۔ "مجھے نومی جیسا بھائی چاہیے۔"

"تو اور بن لو۔؟" اماں تخت پر لیٹی ہوئی تھیں۔ وہیں سے چمک کر بولیں۔ "اماں بابا سے کہو۔ تمہیں نہ جانے کیسے آٹھ سانپوں میں پیدا کر لیا ہے۔"

"مہد بے چارا ہی اولاد نرینہ سے محروم ہے۔ باقی سب کے تو بیٹے ہی بیٹے۔" نادیہ بھابھی قریب سے گزرتے ہوئے استہزائیہ بولی تھیں پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلی گئیں۔ ان کے رنگ بھی کھلنے لگے تھے۔ ملیحہ دل میں اٹھتی غصے کی لہریں دباتی شفق کو ٹوڈلز بنا کر دینے لگی۔ پیپسی ٹوڈلز اور چپس کھانے کے بعد بھی اس کی ضد ہنوز وہی تھی۔

"مجھے بھائی چاہیے۔"

"لا دیں گے بھائی بھی۔" وہ اسے بہلا پھسلا کر نہلانے لگی۔

"کب؟" وہ مچلی۔

"بابا شہر سے لا دیں گے۔" ملیحہ نے اسے ٹالا تھا۔ مگر وہ تو گویا مہد کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ بار بار کچن میں اس سے آکر پوچھتی۔

"ماما! ٹائم کیا ہوا ہے؟ بابا کب آئیں گے۔"

"سات بجے آئیں گے۔"

"سات کب بجیں گے۔؟" وہ بے قراری سے بولی۔

"جب کلاک نے میوزک بجایا۔"

"پہلے بھی تو میوزک سنا تھا میں نے۔"

"اس وقت چھ بجے تھے۔" وہ زچ ہو کر پلٹی۔ "چلو تم کتابیں لے کر آؤ۔"

"میں نہیں پڑھوں گی۔"

"میں چاکلیٹ بھی نہیں دوں گی۔" ملیحہ نے اسے دھمکایا۔

"بابا لا دیں گے۔" اسے کون سا پروا تھی۔

"چاچی! ماما کہہ رہی ہیں کھانا تیار ہے تو دے دیں۔" قاسم کچن کے دروازے میں کھڑا تھا۔ ملیحہ نے ڈونگے میں سالن ڈالا۔ رومال میں روٹیاں لپیٹ کر ٹرے میں رکھیں اور فریج میں سے کھیر کا باؤل بھی نکال کر دیا۔ باری باری سب ہی اپنا کھانا لے کر چلے گئے تھے۔ اتنی توفیق نہیں ہوتی تھی کہ نیچے آکر ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھا لیں۔ اور ادھر منہب ابھی تک شاک میں مبتلا تھا۔ رات کو اس کا فون آیا تو اس کے پوچھنے پر ملیحہ نے صاف صاف بتا دیا۔ وہ حیران تھا۔

"ابھی تک ایک ہی کچن میں سب کا کھانا بنتا ہے۔ اور آپ ہی یقیناً" بناتی ہوں گی۔ کمال کرتی ہیں آپ چاچی! اماں سے بات کریں کہ ان سب کے کچن الگ کر دیں۔ اپنا علیحدہ کھانا بنایا کریں کب تک آپ ان سب کو ٹرے میں سجا سجا کر دیتی رہیں گی۔"

ملیحہ اسے کیا بتاتی کہ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے وہ اماں تو کیا بڑی جیٹھانیوں سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اور وہ سب اسے بے دام کا غلام سمجھ کر حکم چلاتی رہتی تھیں۔

سونیا بھابھی نے بھی کئی مرتبہ اسے احساس دلانے کی کوشش کی تھی۔ "کب تک ان کی خدمتیں کرتی رہو گی۔"

مگر وہ پھر بھی۔ مہد سے علیحدگی کے بارے میں بات نہیں کر سکی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ اماں بی کو کسی ملال میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی وہ یہ چاہتی

تھی کہ اماں کو اپنے انتخاب پر پچھتانا پڑے۔ کل کو یہی جیٹھانیاں اماں کو طعنے تشنے دیں یہ تو اسے کبھی بھی گوارا نہیں تھا وہ تائی جی کا فون سن کر باہر آئی تو شفق دھواں دھار رو رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر اتنا بڑا گومڑ دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے بے ساختہ روتی، چلاتی شفق کو خود سے لپٹا کر پوچھا۔

"نومی اور فہد نے مارا ہے۔"

"چاچی! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔" فہد اور نومی صاف مکر گئے تھے۔ شور کی آواز سن کر نائلہ بھابھی اور نادیہ بھابھی بھی نیچے اتر آئیں۔ اپنی اور اپنے بچوں کی غلطی تو انہوں نے کبھی تسلیم ہی نہیں کی تھی۔ ان دونوں نے چلا چلا کر پورا گھر سر پر اٹھا لیا۔

"موثق اور مسکان تو چلے گئے ہیں۔ اس کا دل ہے ہم بھی مکان خالی کر کے کرایوں پر دھکے کھائیں اس کی بچی کہاں کی مہارانی ہے۔ نہ کھیلا کرے ان کے ساتھ۔" اماں بی ایسے موقعوں پر دانستہ گونگے کا گڑ کھا کے خاموشی کی بکل اوڑھ لیتی تھیں۔ وہ دونوں خوب گرج برس کر اوپر چلی گئی تھیں۔ ملشہ نے دھول مٹی میں لتی شفق کے منہ ہاتھ دھلوا کر کپڑے بدلے پھر ماتھے پر دوائی لگائی۔ شفق بہت سہم گئی تھی۔ سسکاریاں بھرتے ہوئے اس سے چمٹ کر روتے روتے سو گئی۔ سونے سے پہلے اس نے ایک مرتبہ پھر التجا کی تھی۔

"شفق کو بھائی لا دیں ماما! نومی اور فہد گندے ہیں۔ شفق ان کے ساتھ نہیں کھیلے گی۔" اب وہ شفق کی اس فرمائش کو بھلا کہاں سے پورا کرتی۔ خود بھی سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔ جب اٹھی تو مہد گھر آچکا تھا۔ لاؤنج سے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"بچے تو لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ساتھ کھیلنے سے چوٹ بھی لگ جاتی ہے۔ کسی نے جان بوجھ کر شفق کو دھکا تو نہیں دیا۔ ایسی بھی کیا ناراضی کہ ملشہ نے کھانا نہیں کھایا۔ نائلہ نادیہ نے بازار سے روٹی منگوائی تھی۔ بس مہد میکے چلی گئی ہے رہ گئی میں تو کسی کو کاہے کی پروا دوا کھائی تھی۔ پیٹ میں درد بھی تھا۔ رات سے بخار میں پھنک رہی ہوں میں۔ مگر کسی کو کیوں احساس ہونے لگا۔" اماں جلے کٹے لہجے میں بھناتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ ملشہ ناگواری اور غصہ دبائے باہر نکل آئی۔

اماں کو کھچڑی بنا کر دی تو انہوں نے غصے کے اظہار کے طور پر کھانے سے انکار کر دیا۔ ملشہ اس طرح کے رویوں کی بارہ سالوں میں عادی ہو چکی تھی۔ جانتی تھی کہ آدھا گھنٹہ مزید اصرار کروانے کے بعد اماں بی کھچڑی کھا کر اس پر احسان عظیم کر ہی دیں گی۔ مہد روٹی اور مسور کی دال کھاتے ہوئے اماں کے غصے کا پس منظر پوچھ رہا تھا۔

"شفق کو سلاتے ہوئے آنکھ لگ گئی تھی میری۔" اس نے دو لفظوں میں گویا بات سمیٹ دی تھی۔ وہ بدمزگی نہیں چاہتی تھی۔ وہ بات کو طول دینا نہیں چاہتی تھی مگر پھر بھی وہ کچھ ہو گیا تھا جو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ اور جس کی "وجہ" سے ملشہ کے ہاتھوں سے زنجیریں لپٹ گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ دن بھی اتوار کا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح بڑی بھابھیوں نے نچلے پورشن کے مشترکہ صحن کی صفائی، دھلائی میں اس کا ہاتھ نہیں بٹایا تھا۔ چوجک کی شادی کے بعد ملشہ نے کوئی ملازمہ نہیں رکھی تھی کہ وہ لوگ اب کام والی کی تنخواہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ البتہ بڑی بھابھیوں کے ہاں دو دو نوکرانیاں کام کرتی تھیں۔

وہ معمول کے مطابق کوڑے والا ڈرم خالی کروا کے صحن دھونے لگی تھی۔ وائپر لگا کر پائپ سمیٹ کر وہ اوپر چلی گئی۔ سب سے اوپر برآمدے میں واشنگ مشین رکھی تھی۔ سب کے کپڑے اوپر ہی دھلتے تھے۔ ابھی وہ مشین میں پانی ڈال رہی تھی جب شفق کی درد ناک چیخوں نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے منڈیر تک آئی تھی۔

digest library.com

نیچے صحن میں جھانکا تھا اس کا کلیجہ گویا حلق میں آگیا۔ شفق کا خون میں لت پت چھوٹا سا وجود صحن کے عین وسط میں پڑا جھٹکے کھا رہا تھا۔ نومی سائیکل پر بیٹھا چیخ رہا تھا۔ شاید شفق سائیکل سے گری تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ پلٹ کر سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ دو دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

"اتنا خون گیا خون' ہائے میری شفق۔" وہ بے ساختہ چیخ رہی تھی جب نجانے کیسے اس کا پاؤں رپٹا اور وہ منہ کے بل ستائیس سیڑھیوں سے گرتی چلی گئی۔

اس کی سر پر شدید چوٹ لگی تھی۔ مگر خون کا ایک قطرہ نہیں گرا تھا۔ ڈاکٹرز کہتے تھے اگر بلیڈنگ ہو جاتی تو یقیناً" ملیشہ کا نروس سسٹم متاثر نہیں ہوتا۔ اس کے دماغ کی کسی وین میں خون منجمد ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کہتے تھے کہ آپریشن سے وہ بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے۔ مگر آپریشن کے لیے کم از کم آٹھ نو لاکھ روپے کی ضرورت تھی۔

ادھر اماں دہائیاں دے رہی تھیں کہ "دماغ کا آپریشن تو نزار رسک ہے۔ یہ اب ٹھیک نہیں ہونے والی۔ پیسہ بھی ضائع کرو گے اور وقت بھی۔"

شفق بھی ہسپتال میں تھی۔ اس کی تین جگہ سے ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ وہ سائیکل سے گری تھی اور فہد نے اس کے سر پر ہیٹ مارا تھا۔ بچی درد کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی۔ شفق کو ڈیڑھ ماہ بعد ڈسچارج کر دیا گیا تھا البتہ ملیشہ ابھی تک ہسپتال میں تھی۔ چھ مہینے ہسپتال میں رکھنے کے باوجود اس کا ذہن ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

ڈاکٹرز اس کا ایک ہی حل آپریشن بتاتے تھے۔ مہد ان دنوں بہت پریشان تھا۔ دفتر کی طرف سے اسے صرف اسی ہزار قرض ملا تھا۔ یہ رقم بھی آہستہ آہستہ خرچ ہو چکی تھی۔ شفق اب بغیر سہارے کے چل لیتی تھی۔ پہلے کی طرح بھاگتی دوڑتی تھی مگر ملیشہ کا ذہن گویا ایک نقطے پر ٹھہر چکا تھا۔

وہ کسی کو بھی پہچانتی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ شفق کو بھی نہیں۔ دورے کی حالت میں کئی کئی گھنٹے چیختی رہتی۔ کمرے کی حالت ابتر کر دیتی۔ شفق کو بری طرح پیٹنے لگتی۔ یہ کیسی خود فراموشی تھی۔ یہ کیسی دیوانگی تھی۔ یہ کیسی آزمائش تھی۔ مہد رات رات بھر جاگتا رہتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل' زیور وغیرہ بیچ دیا تھا مگر پھر بھی آپریشن کے لیے رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔

بڑے بھائیوں سے بات کی تو انہوں نے اپنی اپنی مجبوریوں کی ایسی ایسی داستانیں سنائیں کہ مہد نے پھر سے بات کر کے گنوانے سے توبہ کر لی۔ موثق برطانیہ میں مقیم تھا اس نے خود ہی فون کر کے بتا دیا تھا کہ کلینک اسٹیبلش کرنے کی وجہ سے وہ بالکل کنگال ہو چکا ہے سونیا بھابھی نے تین لاکھ کا چیک دیا تھا جو کہ ملیشہ کو چھ مہینے ہسپتال رکھنے کی وجہ سے دوائیوں کے بل' ڈاکٹرز کی فیس اور دیگر ضروریات پر خرچ ہوتے چلے گئے۔

سونیا بھابھی کبھی کبھار اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے آجاتی تھیں۔ ان کے میکے والے پیرس سیٹل ہوئے تو وہ بھی نیلی سمیت وہیں جا بسی تھیں۔

یہ گھر وحشت کدہ بنتا جا رہا تھا۔ ملیشہ کی چیخوں میں پوشیدہ نوحے گھر کے مکینوں کو سنائی نہیں دیتے تھے۔ وہ اس پاگل عورت کی دیوانگی سے بے زار ہو چکے تھے یہ بے زاریت نفرت کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ان خود غرض لوگوں پر وہ اپنا خلوص اور قیمتی وقت برباد کرتی رہی تھی۔

"ہمارے بچے نیچے آنے سے خوفزدہ رہنے لگے ہیں۔ خدا کے لیے اماں! مہد سے کہیں اسے یہاں سے لے جائے ورنہ ہم لوگ ہی دنعان ہو جائیں گے۔" اب ملیشہ کا وجود انہیں کھٹکنے لگا تھا۔

بسمہ کہتی "میرے بچوں کو رات بھر نیند نہیں آتی۔" ان کی زبانیں شعلے اگلتیں' کبھی یہ سب ملیشہ کی خوشامد میں منہ سے شیرینی ٹپکاتی تھیں۔ نائلہ کے بچے بھی ذہنی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہے تھے۔ ملیشہ اب کمرے میں بند نہیں رہتی تھی بلکہ باہر بچوں کے درمیان آکر بیٹھ جاتی۔ پھر وہ انہیں پیٹنا شروع کر دیتی

تھی جس کی وجہ سے بچے ہر وقت سہمے رہتے تھے۔
ایک روز اماں نے مہد سے کہا۔
"تیرا انتظار لاحاصل رہے گا۔ بیٹے! یہ اب ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ تم نازنین سے شادی کر لو تیری خاطر ابھی تک جوگ لیے بیٹھی ہے۔ ملشہ سے تمہاری مزید اولاد بھی نہیں ہو سکتی میری بات مان لے مہد!"
مہد عجیب وحشت بھری نظروں سے ماں کو دیکھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخیاں گہری ہونے لگیں۔
"وہ جو میرے مشکل وقت کی ساتھی ہے آج آزمائش اور تکلیف میں اسے چھوڑ دوں۔ کس قدر خود غرض ہیں اماں آپ۔ ملشہ اب آپ کے کسی کام کی نہیں رہی تو اسے بے کار سامان کی طرح پھینک دوں۔ وہ میری بیٹی کی ماں ہے یہ مت بھولا کریں۔ مجھے امید ہے وہ ایک دن ضرور ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آئے گی۔"
"خوش فہمی ہے تمہاری۔" اماں نے تنک کر کہا۔
"دادو! ملشہ چاچی کو کسی اسائلم میں چھوڑ آئیں۔" یہ فہد تھا۔
"چاچی گندی ہیں۔ ہر وقت شور کرتی رہتی ہیں۔ سونے بھی نہیں دیتیں۔" سحر نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
بڑی بھابھیوں نے مشترکہ فیصلہ کر کے اماں بی کی راتوں کی نیندیں اڑا دیں۔
"ہم لوگ یہاں سے کہیں اور شفٹ کر جاتے ہیں۔ دو گھڑی سکون بھی نہیں رہا اس گھر میں۔" اب ملشہ واقعی ان کے کام کی نہیں تھی۔ اس کی محبتوں اور بے لوث خدمتوں کا یہ صلہ تھا۔
"تم لوگ کیوں اپنا گھر چھوڑ کر جاؤ گے۔ میں اسے ہی نہ چلتا کروں۔" اماں نے گویا فیصلہ کر لیا تھا۔ ملشہ نے آج سالن کا دیگچہ الٹ دیا تھا۔ اکثر وہ کچن میں گھس کر کوئی نہ کوئی نقصان کر دیتی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑی جیٹھانیاں سیخ پا ہو جاتیں۔
کبھی کھیر میں نمک الٹ دیتی۔ کبھی چائے میں مرچیں ڈال دیتی۔ ایک دن اس نے اماں کے کپڑے جلا دیئے تھے۔ اس کے بعد اسے زنجیریں پہنا دی گئی تھیں۔ وہ کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔ وہ سارا سارا دن بھوکی رہتی تھی اور بھوک کی وجہ سے چلاتی رہتی۔ اس نے پورے تین ماہ خود کو اذیت دی تھی۔ پھر اسے اپنے اوپر نہیں مہدیار پر ترس آ گیا تھا۔ حالانکہ ابھی وہ اس خود ساختہ پاگل پن میں ان رشتوں کو اور بھی "پرکھنا" چاہتی تھی۔ مگر وہ مہدیار کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ جو اس کی زندگی کا ساتھی تھا۔ وہ جو اس کے سر کا سائیں تھا۔ وہ جو کڑی دھوپ میں رحمت کا بادل تھا۔ وہ کیسے مہدیار کو بے سکون کیے رکھتی۔ وہ کیسے اسے مزید اذیت میں مبتلا رکھتی۔

۞ ۞ ۞

دریا کے اس پار سے مجھے قمر سلطانہ اپنے لائق فائق اور خوبصورت بیٹے سے بیاہ کر لے آئیں۔ بجورت سے اس روشنیوں کے شہر میں آنے تک کا فاصلہ میں نے نیند اور خواب کے عالم میں طے کیا تھا۔ میں اس خواب کی کیفیت سے نکلنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ بارہ ماہ میں نے نیند کی حالت میں گزار دیئے تھے۔ میں نے رشتوں کو نہ سمجھا نہ پرکھا اور بے لوث اپنے انمول جذبات لٹاتی چلی گئی۔
صرف اس خوف کے زیر اثر کہ کوئی تیسرا فریق اماں کو جتا نہ دے کہ ان کا انتخاب غلط تھا اور یہ کہ وہ ان کی ساری بہوؤں میں سے سب سے زیادہ کم رو ہے۔
دیکھا جائے تو اماں بی نے اس نئے تجربے میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ شہر کی لڑکیوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ چکی تھیں اسی لیے اک نیا تجربہ کرنا چاہتی تھیں۔ ان پڑھ اور اجڈ سی بہو لانے کی خواہش اماں بی کو بجورت لے آئی تھی۔ اور میرے چہرے پر گنوار پن کی شاید اتنی گہری چھاپ تھی کہ اماں بی کو خبر نہ ہو سکی کہ میں کچھ تعلیم یافتہ بھی ہوں۔
میری تعلیم ان کے لیے اچھے خاصے دھچکے کا باعث بنی تھی۔ وہ جس غرض اور مقصد کے تحت مجھے لے کر آئی تھیں۔ میں نے ان کے اس مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے

کی ٹھان لی۔ یعنی کہ بے غرض اور بے لوث خدمت کرتی رہی۔ میں ان کی پسند کے سانچے میں ڈھل گئی۔

میرے لیے سب سے اہم اماں بی اور مہد کی ذات تھی اور میں ان کی خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی۔ سو میں نے اپنے فرائض میں قطعاً "کوتاہی نہیں کی۔

حالانکہ اس گھر میں آنے کے کچھ ہی عرصے بعد بڑی بھابھیوں نے میرے اندر شکوک و شبہات کو ہوا دینی چاہی تھی۔

"مہد تو نازنین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ بڑا دھواں دھار عشق چلا تھا دونوں کے درمیان۔ مگر اماں بی کے مجبور کرنے پر اسے ماننا ہی پڑا۔"

مجھے مہد کے رویے سے ایک دن بھی کھوٹ اور بے ایمانی کی مہک نہیں آئی تھی۔ وہ خالصتاً "میرا تھا اگر ان میں پہلے کوئی بات تھی بھی تو اب ختم ہو چکی تھی۔ مہد نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ بھابھیوں کی خواہش پوری نہیں ہو سکی تھی۔

زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی معاشی مسائل سے گزرنا پڑا۔ مسلسل کوشش، جدوجہد اور انتھک محنت نے ہمیں کبھی کسی بھی مقام پر مایوس نہیں کیا تھا۔ مگر ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب اماں بی نے مہد پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

"اس کم ذات اور غربت کی ماری کو دفعان کرو۔"

انہیں میرے خالی ہاتھ آنے کا بھی دکھ تھا۔ اماں بی نے مجھے بانجھ تک کے طعنے دے دیے تھے مگر کون سی چیز تھی جو مہد کے قدم کسی بھی مقام پر ڈگمگانے نہیں دیتی تھی۔ یہ وہ محبت تھی جو میری خدمتوں کے عوض مہد کے دل میں موجزن تھی یہ وہ یقین تھا جو اسے اپنی ماں کے خالص جذبوں پر تھا۔ خالص نیت پر تھا۔

وہ اکثر مجھے کہا کرتا تھا کہ "اماں زبان کی کڑوی ہیں مگر دل کی بری نہیں ورنہ سہیلی کے ایک معمولی خط کو پڑھنے کے بعد وہ اتنا بڑا فیصلہ نہ کر لیتیں۔"

میں خاموشی سے مسکراتی رہتی تھی۔ میں خود بھی اماں کے جذبات کی قدر کرتی تھی۔ بارہ سال تک میں اسی قسم کی خوش فہمیوں کا شکار رہی تھی۔ پھر ایک دن چوچک بڑے سالوں بعد ملنے چلی آئی۔ اس نے مجھے کہا تھا۔

"باجی! آپ تو میرے سے ہر وقت خفا رہتی تھیں۔ آپ کو مجھ پر شک رہتا تھا کہ میں چوری وغیرہ کرتی ہوں مگر قسم سے باجی سوائے فلموں کی سی ڈیز کے میں نے اس گھر میں سے کچھ بھی نہیں چرایا۔ الماری میں سے شیمپو، صابن، سرف اور کھانے پینے والی چیزیں تو اوپر والے "وقتاً فوقتاً" چرا کر لے جاتے تھے۔ سچی بتاؤں باجی! اماں بی کو بڑا ہی ارمان تھا، مہد بھائی جان کی کسی گاؤں کی لڑکی سے شادی کرنے کا۔ انہوں نے میری اماں کو پورے دو ہزار روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ کسی سیدھی سادی، دیسی لڑکی کا رشتہ لادو۔ پھر بھلا ہو اس خط کا۔ اماں بی کی جھٹ پٹ خواہش پوری ہو گئی تھی۔

بڑی بہوؤں نے کبھی پوچھا تک نہیں اور آپ پر خوا مخواہ کے رعب جھاڑتی ہیں۔ آپ جیسی بہو تو انہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی مگر سچی بات ہے اسی کو ناشکرا پن کہتے ہیں۔" میں نے چوچک کو ڈپٹ کر خاموش کروا دیا تھا حالانکہ میں اس کی ہر بات کی دل ہی دل میں قائل ہو چکی تھی۔ اماں بی ایک مفاد پرست خاتون تھیں یہ تو میں جان ہی چکی تھی۔

ان سب کی خود غرضانہ سوچ آہستہ آہستہ مجھ پر کھل چکی تھی۔ اسی لیے تو میں دھیرے دھیرے منہب، علیم اور ملت کے ساتھ ساتھ سونیا بھابھی سے بھی بدگمان ہو چکی تھی۔ میں پہلے کی طرح ان کے لیے کھانے پینے کا اہتمام نہیں کرتی تھی۔ وہ کافی دیر بیٹھی رہتیں اور میں اپنے کاموں میں مصروف یہ ظاہر کرتی کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔

انہیں مجھ سے بہت ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ اسی طرح منہب بھی ہر وقت مجھے بغاوت پر اکساتا رہتا تھا۔

مگر میرا ان سب رشتوں سے دل اچاٹ ہو رہا تھا۔

شاید میرے اندر لگا یہ لاوا پھٹ ہی پڑتا جب شفق کے ساتھ وہ حادثہ پیش آگیا۔

میں چھ ماہ تک ہوش و خرد سے بے گانہ رہی تھی۔ چھ ماہ کے طویل عرصے بعد میرے نروس سسٹم میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی۔ میں نے چہروں کو پہچاننا' تھوڑا تھوڑا بولنا بھی شروع کردیا تھا مگر اس دوران میں بہت کچھ طے کرچکی تھی۔

مجھے کبھی بھی مہد کی محبت پر شک نہیں ہوا تھا مگر میں ان خود غرض رشتوں کو پرکھنا چاہتی تھی۔ میری یہ "پرکھ" بہت سے رشتوں کو مجھ سے دور کرتی چلی گئی۔

اول تو میری تائی جی تھیں۔ جنہوں نے بچپن میں مجھے گود لے لیا تھا۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد دوسری جگہ میری ماں کا نکاح پڑھا کر قانونی طور پر میرے باپ کے حصے کی تمام زمینیں اپنے نام کروانے کے بعد بیچ باچ کر وہ لوگ واہ کینٹ شفٹ ہوگئے تھے۔ لیا کا مکان اور جانوروں میں تین عدد بھینسیں بھی انہوں نے بیچ دی تھیں۔ تائی کو اپنے بھانجے سے بہت محبت تھی۔ سو اس کا مستقبل انہوں نے ہر طرح سے محفوظ کرکے پہلے بھانجے کو باہر سیٹل کیا پھر خود بھی چلی گئیں۔ میری بیماری کا سن کر انہوں نے بھی مہنگائی کا رونا رو کر آنکھیں بدل لی تھیں۔

پھر مہد کے یہ رشتے تھے۔ اس کے بہت اپنے۔ اس کے بہت خاص اور پیارے رشتے مہد کی ماں اس کے یتیم بھتیجے بھتیجیاں' جنہیں میں نے اپنی اولاد کی طرح محبت دی تھی۔ اپنی اندر ممتا کی اس کمی کو میں نے ملت اور مانیہ کے وجود سے پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔

آٹھ سال کے اس ساتھ کو منہیب نے توڑ دیا تھا وہ باہر چلا گیا ملت اور میثم بھی چلے گئے۔ ان دنوں مشکلات کا بڑا کٹھن دور تھا مگر مہد کی خودداری کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اپنی زبان سے سوال کرتا۔ کسی سے مدد مانگتا۔

انہوں نے تو جانا ہی تھا کہ اچھے مستقبل کی خواہش ہر ایک کی آنکھ کا خواب ہوتی ہے۔ اصل صدمہ تو مجھے مانیہ کی ان باتوں سے ہوا تھا جب کراچی سے واپس آنے کے بعد وہ نازیہ بھابھی کے پورشن میں بیٹھی زور و شور سے میری ذات کے بخیے ادھیڑ رہی تھی۔ اس پل اسے بھول چکا تھا کہ اس کی شادی پر لیا جانے والا قرض کس طرح میں نے اور مہد نے رات دن کی پروا نہ کرتے ہوئے انتھک محنت کرکے اتارا تھا۔

"ڈھکالی بکینگ۔ ذرا بھی تو چاچو کے ساتھ سوٹ نہیں کرتیں۔ چاچو کے تو نصیب ہی پھوٹ گئے ہیں نازنین آنٹی کس قدر حسین ہیں۔ چاچو کے ساتھ تو انہی کا جوڑ بننا چاہیے تھا۔" مانیہ میجر سے کرنل کی بیوی بن کر بڑی مغرور ہوچکی تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں اور چہرے پر خوشحالی کی چمک لیے وہ بڑے تفاخر سے بیٹھی تھی۔ میرے سینے میں اسی دن سے توڑ پھوڑ ہونے لگی۔

ایک دیوار تھی جو گر چکی تھی۔ ان بچوں کو "پرکھنے" میں بھی مجھ سے غلطی ہوئی تھی اور اس غلطی کا خمیازہ کل کی اس بچی کے ہاتھوں توہین کی صورت میں میرے حصے میں آیا تھا۔ میرا خلوص' محبت اور وہ رات دن ان کی فکر میں ہلکان ہونا۔ یوں لگ رہا تھا زندگی بھر میں کسی سے خلوص اور "چاہ" کا رشتہ نہ نبھا سکوں گی۔

شفق کو لگنے والی چوٹ تو ایک بہانہ تھی۔ میں نے ستائیس سیڑھیوں سے گرنا ہی تھا۔ میری آنکھیں اسی طرح کھلنا تھیں مجھے اس طرح "ٹھوکر" لگنی تھی۔

رشتوں سے محبتوں سے میرا اعتبار اسی وقت اٹھ گیا تھا۔ جب چھ ماہ بعد میں نے پہلی مرتبہ آنکھیں کھول کر زندگی کو محسوس کرنا چاہا تھا۔ وہ دو نرسیں تھیں جن کی نائٹ ڈیوٹی میرے کمرے میں تھی۔ وہ دونوں ساری رات باتیں کرتی رہی تھیں۔ موضوع گفتگو مہد کی پرسنالٹی اور میری ذلت تھی۔ وہ مہد کو سراہ رہی تھیں۔ اس کی تعریف کررہی تھیں کہ کس طرح وہ مجھ جیسی بیوی کے لیے خوار ہو رہا ہے۔ پھر انہوں نے اچانک موضوع بدل دیا۔ میں نے آنکھیں جان بوجھ کر موندلی تھیں تاکہ انہیں احساس نہ ہو کہ

digest library. com

میں ہوش میں آچکی ہوں۔

مجھے محسوس ہوا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ پھر دو خواتین آپس میں بات چیت کرنے لگیں۔ یہ دونوں نادیہ بھابھی اور بسمہ تھیں۔ نرسیں شاید کمرے سے جاچکی تھیں۔ تبھی یہ دونوں مطمئن سی باتیں کرنے لگیں۔

"اب مہد کو دکھانے کے لیے دن میں ایک مرتبہ تو ضرور ہی آنا پڑتا ہے۔" یہ نادیہ بھابھی تھیں۔

"تو اور کیا دنیاداری کے تقاضے پورے کرنے کہاں آسان ہیں۔" بسمہ بے زاری سے بولی۔

"نہ جانے یہ ٹھیک ہوتی بھی ہے کہ نہیں۔ ڈاکٹر نے تو دماغ کا آپریشن بتایا ہے۔ یہ کام تو بڑا رسکی ہے۔ میری کزن تو دوران آپریشن ہی مر گئی تھی۔" نادیہ بھابھی نے مصنوعی آہ بھر کے کہا۔ یہ وہی مطلبی عورت تھی جو کام کروانے کی غرض سے ہر وقت میری خوشامد کے لیے تیار رہتی۔

"اس کے بھی بچنے کے چانسز کم کم ہی نظر آتے ہیں۔" بسمہ نے لمبی سی جمائی لی۔

"رات کو مہد کچھ پیسے مانگ رہا تھا۔ میں نے تو صاف صاف جتا دیا ہے۔ اتنے اخراجات ہیں اوپر سے بڑھتی ہوئی مہنگائی۔ ہمارے پاس کون سا خزانے دفن ہیں۔"

"سونیا نے تین لاکھ کا چیک دیا ہے۔" بسمہ کو اچانک خیال آیا تو پوچھنے لگی۔

"ہونہہ۔ نری شوبازی۔" نادیہ بھابھی نے تنفر سے کہا کسی کی اچھائی ان کے نزدیک شوبازی تھی۔

"ویسے اماں بی تو مہد کے لیے نئی دلہن لانے کے چکروں میں ہیں۔" بسمہ معنی خیزی سے بولی۔

"اس بڑھیا کی ملشہ سے زیادہ خدمت کوئی نہیں کرسکے گا۔ نجانے مائی کے دماغ میں کیا خناس بھرا ہے۔" نادیہ بھابھی کے لہجے میں کڑواہٹ تھی۔ (بس اتنی سی عزت تھی اماں بی کی ان کی بہوؤں کے دلوں میں۔)

"ایک لحاظ سے تو بہتر ہی ہے۔ اب ملشہ تو نجانے کب ٹھیک ہوگی۔ اماں بی جیسی نکتہ چیں عورت ہمارے تمہارے بس میں کہاں ہے کہ انہیں دو چار دن ساتھ رکھ لیا جائے۔ کھانے میں اعتراض، پہننے اوڑھنے میں اعتراض۔" بسمہ تلخی سے کہنے لگی۔ "خبطی بڑھیا۔" وہ بڑبڑائی۔

"ہوں، بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے۔ پھر نازنین ہی مہد کی دلہن بن کر آئے گی۔ بے چاری ابھی تک کنواری بیٹھی ملشہ کے مرنے کا انتظار کررہی ہے۔"

نادیہ کی تمسخرانہ ہنسی گونجی۔ ڈاکٹر کی آمد کے ساتھ ہی وہ دونوں اٹھ کر چلی گئی تھیں اور میں نے بھی گہری سانس کھینچ کر آنکھیں کھول لیں۔ ڈاکٹر یاسر حیران رہ گئے تھے۔ پھر میں نے نجانے کیسے انہیں قائل کیا تھا بہرحال وہ میرے ڈرامے میں شریک ہوگئے۔ اگلے تین مہینے تک "محبوب منزل" والوں کا امتحان شروع ہوچکا تھا۔

میں نے ان سب کو ناکوں چنے چبانے کی پلاننگ کر رکھی تھی۔ میرا منصوبہ ابھی تک کامیاب تھا اور اس خود ساختہ پاگل پن کی لپیٹ میں میری پیاری بیٹی شفق بھی آچکی تھی۔

دراصل میں انہیں شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی سو ان سب کو ذہنی طور پر ڈسٹرب کرکے میں مطمئن تھی۔ ان خود غرضوں کے لیے اس سے بڑی سزا میرے اختیار میں نہیں تھی۔ مگر پھر اس چلچلاتی دوپہر میں مجھے مہد پر ڈھیروں پیار کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ ترس بھی آگیا۔

وہ تھکا ہارا نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانے گھر آیا تھا۔ اور آتے ہی میرے دورے کی خبر نے اسے اور بھی مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ پھر ننھی شفق کے بال بناتے، اس کو کھانا کھلاتے دیکھ کر میرے دل میں مہد کے لیے عقیدت محبت اور چاہتوں کا طوفان امڈ آیا تھا۔ سو مزید ایکٹنگ ممکن ہی کہاں تھی۔ اسی لیے میں دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے قریب دو زانو کا ہو کر بیٹھ گئی۔

"مہد! آئی لو یو۔" میرے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر

تھے۔

"ملشمہ! تم، تم ٹھیک ہو گئی ہو۔ تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہ بتاؤ یہ کون ہے؟" مہد نے خوشی سے چور آواز میں کہتے ہوئے شفق کو میرے سامنے کیا۔

"میری بیٹی۔" محبت کے اس مظاہرے پر میری آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"آئی لو یو تو کھری نور۔" مہدی نے بے ساختہ مجھے بانہوں کے حصار میں لے لیا۔

"میری ماما ٹھیک ہو گئی ہیں۔" شفق قلانچیں بھرتی باہر کی طرف بھاگی تھی اسی اثناء میں پورے گھر کے لوگ ہمارے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ سب حیران تھے۔ ششدر تھے۔ گویا انہیں میرے تندرست ہونے کی قطعاً امید نہیں تھی۔

میری صحت مندی کی خوشی میں مہد نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ اس دعوت میں نازنین اور مامی نے بھی شرکت کی تھی۔ سب سے بڑا سرپرائز منہیب، ملت اور میم کی آمد کی صورت میں ملا تھا۔ منہیب ہمارے لیے بحرین کے ویزے لایا تھا بقول منہیب کے کہ وہ لوگ مہد چاچو کی فیملی کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

ڈاکٹر یاسر کو میں نے بطور خاص انوائٹ کیا تھا۔ بہر حال میں ان کی شکر گزار تھی کہ رشتوں کو جانچنے، پرکھنے میں انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔

نازنین، مہد سے جھگڑ رہی تھی کہ اس نے میرے ساتھ ہونے والے حادثے کی خبر اسے کیوں نہیں دی۔ ادھر منہیب بھی اسی بات پر روٹھا بیٹھا تھا۔ شفق ملت کی گود میں خوب چہک رہی تھی۔ "آپ نے ہمیں بھی ان لوگوں جیسا سمجھ رکھا تھا۔" منہیب ناراضی سے کہہ رہا تھا۔ اوپر والی ساری بھابھیاں بمعہ فیملیز کے نیچے موجود تھیں مگر اب میں ان کے ظاہر باطن کو اچھی طرح سے جان چکی تھی۔ تبھی ان کے اور اپنے درمیان میں نے ایک خاص "حد" مقرر کر لی تھی۔

اماں بی بھی شرمندہ شرمندہ سی بہوؤں کے درمیان بیٹھی تھیں۔ انہیں اب اپنی انہی بہوؤں کے درمیان ہمیشہ رہنا تھا۔ کیونکہ مہد نے منہیب کی آفر کو قبول کر کے بحرین جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تین دن بعد ہماری فلائٹ تھی اور اماں بی کی کھسیانی سی مسکراہٹ دراصل میں ان مسکراہٹوں کے مفہوم کو بھی جان گئی ہوں ہر ایک مسکراہٹ واقعی ہی "مسکان" نہیں ہوتی۔ بعض مسکراہٹیں غرض اور مطلب کے لبادوں میں لپٹی ہوتی ہیں جیسا کہ بھابھیوں اور اماں بی کی التجا کرتی مسکان ان سب کی خواہش تھی کہ میں رک جاؤں۔ بحرین جانے کے فیصلے کو بدل دوں مگر میں ان سب مطلبی، خوشامدی اور خود غرض لوگوں میں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

ادھر ڈاکٹر یاسر مامی کے پاس کھڑے تھے۔ اور نازنین کے ساتھ کے لیے التجا کر رہے تھے۔ بے چارے کیوپڈ کے تیر کا شکار ہو گئے تھے۔ مہد کی سفارش اور میری درخواست پر ثریا مامی نے غور کرنے کے بارے میں فیصلہ کر لیا تھا۔

جاتے جاتے انہوں نے نازنین اور ڈاکٹر یاسر کی منگنی کا دھماکا کر دیا۔

ایک اور بات میں نے مہد کو اس خود ساختہ بیماری کے متعلق نہیں بتایا۔ کچھ باتیں مصلحتاً چھپانی پڑتی ہیں امید ہے آپ بھی اس راز کو لیک آؤٹ نہیں کریں گے۔ اپنی شادی شدہ زندگی کو بچانے کے لیے مجھے بہت سی کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جیت ہمیشہ سچائی، خلوص اور خالص جذبوں کی ہوتی ہے۔ خالص رشتوں کو کھو کر صرف ملال باقی رہ جاتا ہے ایسا ہی ملال اماں بی کے چہرے پر کھنڈا مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے۔ ان کے پوتوں اور بہوؤں کے پاس ان کے لیے چند پل بھی نہیں ہیں۔ انہیں مزید احساس دلانے کے لیے میرا یہاں سے جانا ضروری ہے۔

سسرال الجبرے کے کسی مشکل ترین اور پیچیدہ سوال کی مانند ہے اسے معاملہ فہمی، ذہانت اور عقلمندی سے بہتر طریقے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ اور میتھ تو میرا فیورٹ سبجیکٹ تھا خیر میں بھی کن فضول سوچوں میں الجھ رہی ہوں۔ ابھی مجھے سب کے لیے

گرین ٹی بنانا ہے۔ پھر اپنی اور منیب لوگوں کی شاپنگ کرنی ہے۔ وہاں اس کا ایک پیارا سا بیٹا ہے۔ اس کے لیے کرتے اور شلواریں سینی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے مونی کے لیے سویٹر بننے ہیں۔ قمیصوں پر کڑھائی کرنی ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ ملت کے لیے کھجور کا حلوہ بنانا ہے۔ منیم کے لیے برفی منگوانی ہے اور اماں بی کو سوپ بنا کر دینا ہے۔ جب تک یہاں ہوں ان کی خدمت میرا فرض ہے۔ پھر میں اپنی اس بارہ سالہ پرانی پختہ ہو چکی عادت کا کیا کروں۔ اور ادھر شفق میرے ڈوپٹے کا پلو تھام کر "بھائی چاہیے" کی گردان کر رہی ہے۔ اسے بھائی کا "لارا" لگا کر گرین لے کر جاتا ہے۔ جہاں سچ مچ اس کے لیے ایک عدد گورا چٹا بھائی موجود ہے اور ادھر مہد بیڈ روم میں کھرّاٹے آوازیں دے رہے ہیں۔ اور میں اک نئی ترنگ اور نئے ولولے کے ساتھ اپنے بیڈ روم کی طرف جا رہی ہوں۔

مہد کو شدید نیند آ رہی ہو گی اور بقول اماں بی کے انہیں میرے بغیر نیند بھلا کیسے آئے گی۔ اماں بی نے اپنے "مفاد" کو مدنظر رکھ کر اپنی بہن سے کیے گئے وعدے کو نبھایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میں ان کی توقعات پر پورا اترنے کے متعلق ٹھان چکی تھی۔ انہیں کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہیں تھی۔ افسوس اس بات کا نہیں تھا کہ اماں بی نے میرے ساتھ کبھی بھی اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ دکھ تو صرف یہ تھا کہ انہوں نے مجھے جوچک جتنی اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ وہ مجھے مہد کی بیوی نہیں اس گھر کے لیے اور اپنی بہوؤں کے لیے "باندی" بنا کر لائی تھیں۔ جو کہ ان کی اور ان کی بہوؤں کی خدمت میں چوبیس گھنٹے جتی رہتی۔ اگر وہ انصاف سے کام لیتیں تو ہمارے کچن بھی الگ کر سکتی تھیں۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے لاشعور میں ایک بات ہمیشہ زندہ رہی تھی کہ میں ان کے بیٹے کے جوڑ کی نہیں ہوں۔ اور جو ان کے بیٹوں کے جوڑ کی تھیں آج وہ اماں بی کے پاس دو گھڑی ٹھہر کر حال احوال پوچھنے کی زحمت گوارا بھی نہیں کرتی تھیں۔

سونیا بھابھی نے ٹھیک کہا تھا کہ اماں بی "بدنیت" ہیں اور نیت جب تک خالص نہ ہو کبھی بھی "مراد" نہیں پوری ہوتی۔ رنگ، نسل، ذات پات پر "تقویٰ" کو فوقیت اسی لیے دی گئی ہے تاکہ ثابت قدم رہیں، ہم ظاہری چمک دمک پر فریفتہ نہ ہوں اور وہ اماں بی جیسے بدنصیب لوگ ہوتے ہیں جو ہاتھ آئی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے اور پھر ملال اور پچھتاوے کے گرداب میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

digest library.com

رضیہ جمیل کے شاہکار افسانے

"بدریا برس گئی اُس پار"

شائع ہو گیا ہے۔ خوبصورت گیٹ اپ
بہنوں کے لیے خوبصورت تحفہ
قیمت -/200 روپے

اس کے علاوہ "2" مکمل ناولوں کے نئے
ایڈیشن شائع ہو گئے ہیں۔

"درد کے فاصلے"

قیمت -/400 روپے

"آج گگن پر چاند نہیں"

قیمت -/200 روپے

منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی